جناب مشفق خواجہ سے متعلق متفرق مواد

کتابیں، کالموں کے مجموعے، منتخب کالم اور بہت کچھ

راشد اشرف، کراچی۔ ۱۸ جون، ۲۰۱۴۔ zest70pk@gmail.com

مشفق خواجہ (۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ ۔ ۲۱ فروری ۲۰۰۵)۔ایک نام، ایک عہد، ایک کھرا محقق........جن کے دنیا سے گزر جانے کے بعد ان گنت لوگوں نے خود کو بے سہارا پایا۔وہ لوگ جو کتاب سے محبت کرتے تھے، تحقیق سے لگاؤ رکھتے تھے، جو ان کے کالموں کے رسیا تھے اور جو ان کے کتب خانے کے اسیر تھے۔ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے ان کی وفات پر یہ قطعہ تاریخ وفات کہا تھا:

تھا بسکہ غنیمت دم مشفق خواجہ۔۔ کیسے نہ کریں ماتم مشفق خواجہ۔۔ بے سر ہوا، علم اور بے پا تحقیق۔۔ ہاتف جو پکارا غم مشفق خواجہ

زیر نظر پی ڈی ایف میں خواجہ صاحب سے متعلق مواد کی تفصیل کو یک جا کردیا گیا ہے، نیز کتابوں کی فہرست بھی شامل کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

مشفق خواجہ کی تحریر و مرتب کردہ کتابیں، مشفق خواجہ کے فن و شخصیت پر تحریر کردہ کتابیں، مشفق خواجہ کے خطوط کے مجموعے، مشفق خواجہ پر کی جانے والی تحقیق (ایم فل و پی ایچ ڈی) کی تفصیل (مقالے کے سرورق کے عکس)، مشفق خواجہ کے کالموں کے مجموعے، مشفق خواجہ کی تصاویر، مشفق خواجہ پر لکھے دو عدد تحقیقی مضامین، مشفق خواجہ کے چند پر لطف کالم۔

مشفق خواجہ مرحوم کے چھوٹے بھائی اور راقم کے کرم فرما جناب خواجہ طارق کا راقم کے نام لکھا ایک خط (۱۷ جون، ۲۰۱۴) بھی ابتدا میں شامل ہے۔طارق صاحب نے اس سلسلے میں کئی اہم معلومات فراہم کیں۔راقم ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہے۔

مشفق خواجہ کی تالیفات و تصنیفات کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

۱۔خوش معرکہ زیبا (تذکرہ شعراء)۔مجلس ترقی ادب لاہور سے دو جلدوں میں ۱۹۷۰ اور ۱۹۷۱ میں شائع ہوئی۔۲۔ پرانے شاعر، نیا کلام۔سہ ماہی غالب کراچی میں ۱۹۷۵ سے ۱۹۷۶ تک قسط وار شائع ہوا۔۳۔ابیات۔مجموعہ

کلام۔ ۱۹۷۸، کراچی سے شائع ہوا۔ ۴۔ اقبال (احمد دین۔ مشفق خواجہ نے از سر نو مرتب کی)۔ ۱۹۷۹ میں انجمن ترقی اردو، کراچی سے شائع ہوئی۔ ۵۔ غالب اور صفیر بلگرامی۔ ۱۹۸۱ میں کراچی سے شائع ہوئی۔ ۶۔ تخلیقی ادب۔ یہ ادبی جریدہ پانچ جلدوں میں ۱۹۸۰ تا ۱۹۸۵، کراچی سے شائع ہوا۔ ۶۔ جائزہ مخطوطات اردو۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور سے ۱۹۷۹ میں شائع ہوئی۔ ۷۔ تحقیق نامہ۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور سے ۱۹۹۱ میں شائع ہوئی۔ ۸۔ انتخاب کلام میر۔ ۲۰۰۰۔ ۸۔ تقریباً دو درجن تحقیقی مقالات لکھے جو برصغیر کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوئے۔ ۹۔ ریڈیو پاکستان کے لیے ۱۹۶۵ تا ۱۹۷۶، مختلف موضوعات پر پانچ سو فیچرز لکھے۔ ۱۰۔ ۱۹۷۱ سے ۱۹۹۷ تک مختلف اخبارات و رسائل (صداقت، جسارت، تکبیر، زندگی) کے لیے دو ہزار سے زائد سیاسی و ادبی کالم لکھے۔ ۱۱۔ کلیات یگانہ (یاس یگانہ چنگیزی)۔ ۲۰۰۳۔ ۱۲۔ یاد ایام۔ ۲۰۰۵

مشفق خواجہ کے منتخب کالموں کے مجموعوں و دیگر کتب کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

۔ خامہ بگوش کے قلم سے۔ مرتبہ: مظفر علی سید۔ پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور۔ ۱۹۹۵۔ سخن در سخن۔ مرتبہ: مظفر علی سید۔ اکادمی بازیافت، کراچی۔ ۲۰۰۴۔ سخن ہائے نا گفتنی۔ مرتبہ: مظفر علی سید۔ اکادمی بازیافت، کراچی۔ ۲۰۰۴۔ سخن ہائے گسترانہ۔ مرتب: انور سدید۔ فضلی سنز کراچی۔ ۲۰۰۶۔ سن تو سہی۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ مرتبین: خواجہ عبدالرحمان طارق / انور سدید۔ ۲۰۰۸۔ خامہ بگوشیاں۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ مرتبین: خواجہ عبدالرحمان طارق / انور سدید۔ ۲۰۱۰

کالموں کے ان مجموعوں کے علاوہ مشفق خواجہ کے خطوط کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۔ مشفق نامے۔ مرتب: محمد مختار عالم حق۔ خطوط مشفق۔ مرتب: ڈاکٹر طیب منیر۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۷۔ مکتوبات مشفق خواجہ۔ مرتب: ڈاکٹر سید حسن عباس۔ متعلقات مشفق خواجہ۔ مرتبین: ساحر شیوی، صابر ارشاد، سید معراج جامی۔ کراچی۔ ۲۰۰۸۔ مکاتیب مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ ناشر: حکیم عروہ سلیمانی۔ فروری ۲۰۰۸۔ مکتوبات مشفق خواجہ بنام نظیر صدیقی۔ ادبیات، لاہور۔ ۲۰۱۰۔ مراسلت۔ صدیق

جاوید۔مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور۔ ۲۰۱۱ رقعات مشفق خواجہ۔بنام ڈاکٹر سلیم اختر و ڈاکٹر طاہر تونسوی۔القمر انٹر پرائز،لاہور۔۲۰۱۲۔

مشفق خواجہ پر لکھی گئی چند کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

۔مشفق خواجہ۔ایک مطالعہ۔خلیق انجم۔جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۹۸۵۔جوش اور خامہ بگوش۔خواجہ عبدالرحمٰن طارق (برادر، مشفق خواجہ) ۔فضلی سنز، کراچی ۔۲۰۱۰۔ مشفق من خواجہ من ۔محمد مختار عالم۔ بک مین، لاہور۔۲۰۰۵ ۔تدوینات مشفق خواجہ۔ایک تعارف۔محمد قاسم ۔۲۰۰۶۔ مشفق خواجہ۔ایک کتاب۔انور سدید۔پورب اکادمی، اسلام آباد۔۲۰۰۸۔ مشفق خواجہ۔فن اور شخصیت۔محمد اسلام نشتر۔مقتدرہ قومی زبان۔ ۲۰۰۸۔مزید خامہ بگوشیاں۔مرتبین: ڈاکٹر انور سدید، خواجہ عبدالرحمٰن طارق۔مقتدرہ قومی زبان۔۔۔اس کے علاوہ ادبی جرائد روشنائی ،اوراق،سفیر اردو،اخبار اردو،سخن ور،عبارت،الزبیر،نوادر، ماورا،مکالمہ،الاقربا،عبارت اور کتاب نے ان پر ادبی گوشے شائع کیے جبکہ ماہنامہ قومی زبان نے ۲۰۰۶ میں مشفق خواجہ نمبر شائع کیا۔ہندوستان میں بھی مختلف ادبی جرائد نے ان پر گوشے شائع کیے۔

مشفق خواجہ پر لکھے گئے تحقیقی مقالوں کی تفصیل اس طرح ہے:

۔خامہ بگوش۔ایک مطالہ ،ایم فل، حیدالرحمٰن خان، علامہ اقبال یونیورسٹی ،اسلام آباد۔۲۰۰۲۔۔۔۔مشفق خواجہ کے مطبوعہ مکاتیب،ثناء جبیں،ایم اے، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ،لاہور۔۲۰۰۷۔۔۔۔۔مشفق خواجہ۔احوال و آثار،محمود احمد کاوش، پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ،لاہور۔ 2011۔۔۔مشفق خواجہ کی مکتوب نگاری، غلام یسین انجم، پی ایچ ڈی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز ،اسلام آباد۔زیر تنقیح۔۔۔۔۔مشفق خواجہ کی ادبی کالم نگاری، طارق کلیم،ایم فل،سرگودھا یونیورسٹی سرگودھا۔زیر تنقیح۔

خصوصی شکریہ: ڈاکٹر خالد ندیم،سرگودھا

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ پیہم نوازشوں کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ ڈاکٹر خالد ندیم صاحب میرے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ ان کی تقریباً تمام تصنیفات و تالیفات میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ وضع دار آدمی ہیں۔ میری دعاؤں میں شامل رہتے ہیں۔

جس کتاب کے متعلق آپ نے استفسار فرمایا ہے، وہ میرے ایک عزیز کی تصنیف ہے (بلکہ ناپختہ تحریر ہے) جن کا جوان سال بیٹا جو ڈاکٹر تھا، کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر انھیں داغ مفارقت دے گیا۔ انھوں نے یہ کتاب (اپنی دلی تسلی کے لئے) شائع کرا کے عزیز و اقارب میں تقسیم کر دی تھی۔ مقصد مختصر کہ یہ کتاب ایسی نہیں کہ اس کے لئے تگ و دو کی جائے۔

آپ کی تحریروں کا میں نے بالاستیعاب مطالعہ کیا اور محظوظ ہوا۔ آپ نے ہر مسلہ تبصرے میں برادر بزرگ کی خوب پیروی کی ہے اور یہ اس لئے ممکن ہو سکا کہ آپ نے کتاب کا بغور اور ماورائے بینی سے مطالعہ فرمایا ہے۔ جو اہل علم کا

سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ جب کتاب ہاتھوں میں ہو تو دنیا کی ہر نعمت
کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میں نے حال میں محسوس کیا ہے کہ آپ کا نیا ایک
اسلوب ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ نکھر کر سامنے آئے گا ان شاء اللہ
آپ نے جو خط اور رسالہ کی بات کی ہے، اسے بھی دیکھا ہے جو بیٹے (برجے)، خواجہ خرم طارق
کا میدان عمل آئی ٹی ہے۔ آج کل میں اپنے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر خواجہ خسرو طارق کے
پاس ولی فیلڈ شکن، ڈیلےویر میں مقیم ہوں۔ ان شاء اللہ اگست کے پہلے
ہفتے میں ہی ڈورو متی (TX) واپس جاؤں گا تو خرم سے کہوں گا کہ
آپ کی خوبصورت سی ویب سائٹ بنا دے جسے آپ بھی استعمال کر سکیں۔
جب بھی آپ یاد فرماتے ہیں، میرے دل میں یہی خیال آتا ہے
کہ آپ جیسے مخلص دوست کا مل جانا ملاقات مسیحا و خضر سے کم نہیں۔

والسلام دعاگو

محبت گرامی
جناب راشد اشرف صاحب
کراچی۔

معتبر خواجہ عبد الجبار طارق
۱۷ جون ۲۰۱۴

Karachi
1979

اقبال

مولوی احمد دین

مرتبہ مشفق خواجہ

علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر اردو میں شائع ہونے والی پہلی کتاب

ابیات

مشفق خواجہ

ابیات

مشفق خواجہ

خوبصورت، معیاری کتابیں

القمر انٹرپرائزز
اہتمام: محمد سعید اللہ صدیقی

طبع : اوّل ۲۰۱۲ء
مطبع : عرفان افضل پرنٹرز، لاہور
سرورق : آغا نثار
قیمت : -/ ۲۵۰ روپے

کچھ اس طرح سے ترا غم دیے جلاتا تھا
کہ خاکِ دل کا ہر اک ذرہ جگمگاتا تھا

اسی لیے نہ کیا تلخیٔ جہاں کا گلہ
ترا خیال پسِ پردہ مسکراتا تھا

نہ یاد رکھتا تھا مجھ کو نہ بھول جاتا تھا
کبھی کبھی وہ مجھے یوں بھی آزماتا تھا

ہر آئنہ تھا سراپا حجاب میرے لیے
میں اپنے آپ کو دیکھوں، نظر وہ آتا تھا

نظر چرا کے وہ گزرا قریب سے لیکن
نظر بچا کے مجھے دیکھتا بھی جاتا تھا

وہاں بھی سایۂ دیوار اُس کا یاد رہا
خود اپنا سایہ جہاں ساتھ چھوڑ جاتا تھا

اداس کمرہ مہکتا تھا کس کی یادوں سے
وہ کون شخص تھا، کیا تھا، کہاں سے آتا تھا

چمکتے تھے در و دیوار آئنوں کی طرح
ان آئنوں میں کوئی عکس مسکراتا تھا

Title Design By:
القمر

تحقیق نامہ

مشفق خواجہ

غالب

اور

صفیر بلگرامی

مشفق خواجہ

Karachi
2003

کلیاتِ یگانہ

میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

کلیاتِ یگانہ

Kulliyat-e-Yagana

(Poetry)

Compiled By : **Mushfiq Khawaja**

پہلی اشاعت : جنوری ۲۰۰۳ء

ناشر : اکادمی بازیافت

اردو سینٹر، کمرہ نمبر۴ (پہلی منزل) اردو بازار، کراچی۔ فون : ۲۶۳۴۳۳۰

کمپوزنگ : لیزر پلس، اردو بازار، کراچی

قیمت : ۵۰۰/ روپے (پاکستان میں)

۳۵/ امریکی ڈالر (بیرونِ ملک)

مرتب

مشفق خواجہ

یگانہ کا مکمل کلام کبھی شائع نہیں ہوا۔ جو مجموعے چھپے ہیں، اُن میں بھی سارا کلام نہیں ہے۔ زیرِ نظر کُلیات میں پہلی مرتبہ یگانہ کو مکمل طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اِس میں نہ صرف تمام مطبوعہ مجموعے شامل ہیں، بلکہ وہ کلام بھی ہے جو یگانہ کی نوشتہ بیاضوں، خطوں، ہم عصر ادبی رسائل اور ''گنجینہ'' کے ایک ایسے نسخے سے دستیاب ہوا ہے جو ۱۹۵۱ء میں خود یگانہ نے مرتّب کیا تھا اور جس کا بخطِ یگانہ نسخہ مرتّبِ کُلّیات کے پاس ہے۔

کُلّیات کے شروع میں مرتّب کی تین تحریریں دیباچہ، سوانحِ یگانہ اور مآخذ شامل ہیں جن میں کلام اور شاعر دونوں کے بارے میں ضروری تفصیلات ملتی ہیں۔ آخر میں تین سو صفحات پر مشتمل حواشی ہیں جن سے کُلّیات میں شامل ہر غزل اور ہر رُباعی کا زمانۂ تصنیف متعین کیا گیا ہے، مآخذ بتائے گئے ہیں، شاعر نے جو اصلاحیں اور ترمیمیں کی ہیں، اُن کی تفصیلات دی گئی ہیں نیز دیگر متعلقہ امور پر بحث کی گئی ہے۔ کُلّیات میں فرہنگ بھی شامل ہے جس میں اُن الفاظ کے معانی درج کیے گئے ہیں جو آج کے قاری کے لیے اجنبی ہیں، یا مانوس الفاظ کے وہ خاص معانی بتائے گئے ہیں جو مطلوب و مرادِ یگانہ ہیں۔

اِس کُلّیات کی صورت میں پہلی مرتبہ بیسویں صدی کے کسی شاعر کا کلام ایسے انداز اور اہتمام سے منشائے مصنّف کے مطابق مرتّب کیا گیا ہے جو اردو میں تدوین کی روشن اور منفرد مثال ہے۔

کُلّیاتِ یگانہ
میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

AB
ACADEMY BAZYAFT

فہرست

غلط نامہ

خود اپنی کتاب پر دیباچہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ کسی دوسرے کی کتاب پر لکھنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ پڑھے بغیر اُس کی وہ خوبیاں تلاش کر لی جاتی ہیں جو اُس میں نہیں ہوتیں۔ اپنی کتاب کی جھوٹی تعریف تو الگ رہی، سچی تعریف بھی نہیں کی جا سکتی کیوں کہ خدشہ یہ ہوتا ہے کہ اُسے بھی جھوٹ ہی سمجھا جائے گا۔ مثلاً اگر ہم یہ عرض کریں کہ اِس وقت جو کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ ایک سنجیدہ کتاب ہے جو بعض سنجیدہ مقاصد کے حصول کے لیے نہایت سنجیدگی سے لکھی گئی ہے، تو آپ پہلے لفظ "سنجیدہ" کے کئی بار استعمال پر مسکرائیں گے، اور پھر نہایت سنجیدگی سے یہ فرمائیں گے، اگر یہ کتاب سنجیدہ ہے تو غیر سنجیدہ کتاب کسے کہا جائے گا۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر، لیکن خدا لگتی کہنے میں اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو یہ فرمایئے، کیا یہ کتاب ویسی نہیں ہے جیسی اردو میں عام طور پر تنقیدی کتابیں لکھی جاتی ہیں؟ فرق صرف یہ ہے کہ اردو کی تنقیدی کتابوں کے مصنفوں کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ کسی غیر ملکی زبان سے ترجمہ نہیں ہے بلکہ دو اور دو چار کی طرح واضح ہے۔ ہاں کہیں کہیں دو اور دو کا حاصل جمع تین یا پانچ بھی ہو گیا ہے۔ لیکن اس عمل کا اردو کے محاورے "تین پانچ کرنا" سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محاورہ اردو کے پیشہ ور نقادوں ہی کے حوالے سے اچھا لگتا ہے جو بقولِ شخصے، تنقید کم لکھتے ہیں، گھوڑوں پر رقم زیادہ لگاتے ہیں۔ گھوڑوں پر رقم لگانے میں کبھی نفع ہوتا ہے اور کبھی نقصان۔ مگر ہم جو کچھ لکھتے ہیں وہ سراسر خسارے کا سودا ہے کیونکہ ہم سے وہ لوگ عموماً ناراض ہو جاتے ہیں جن کو موضوع بنا کر ہم اظہارِ خیال کی جرأت کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے ہمیشہ نیک نیتی سے لکھا ہے مگر آج کل نیت کو کون دیکھتا ہے، صرف وہی دیکھا جاتا ہے جو کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔ کیا زمانہ آگیا ہے کہ لکھنے والے کو غلط سمجھا جائے اور اس کی تحریر کو درست۔

بہرحال اب جب کہ کالموں کا انتخاب کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے، ہم یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ جن ادیبوں پر ہم نے لکھا ہے، اُن سب کے لیے ہمارے دل میں احترام بھی ہے اور محبت بھی۔ محبت میں چونکہ سبھی کچھ جائز ہوتا ہے، اس لیے کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جنھیں غالب کے لفظوں میں "سخن گسترانہ" کہا جا سکتا ہے۔ امید ہے ہماری یہ "سخن گستری" آیندہ کے خوشگوار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوگی۔ "خوشگوار تعلقات" سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہمارے ممدوحین وہی کچھ لکھتے رہیں جو اَب تک لکھتے رہے ہیں، اور ہم اُن کے لکھے پر بساط بھر اظہارِ خیال کرتے رہیں۔ جب ہم اُن کے لکھے کا برا نہیں مانتے تو اُنھیں بھی ہمارے لکھنے پر ناخوشی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے ہماری مذکورہ بالا معذرت خواہانہ باتوں پر بعض لوگوں کو یقین نہ آئے لہٰذا ہم اُن کی تالیفِ قلب کے لیے اعلان کرتے ہیں کہ اِس کتاب میں جتنے بھی نام آئے ہیں، سوائے لاغر مرادآبادی کے نام کے، وہ سب فرضی ہیں۔ ناموں کی جزوی یا کلّی مماثلت اتفاقی ہو سکتی ہے، ارادی نہیں۔

ہمیں اِس موقع پر وہ لوگ بھی یاد آرہے ہیں جو اَب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ مرحومین کے بارے میں کوئی کالم کتاب میں شامل نہ کیا جائے لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ مرحومین کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اُن کا ذکر اُسی طرح کرتے رہیں جس طرح اُن کی زندگی میں کرتے تھے تاکہ وہ ہمیں اپنے آس پاس چلتے پھرتے نظر آتے رہیں۔ اِس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب زندہ ادب کے بارے میں نہ سہی، زندہ ادیبوں کے بارے میں ضرور ہے۔

کالموں کا انتخاب شائع کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہ تھا کیونکہ ہمارا خیال یہ ہے کہ جس ادبی معاشرے میں سبھی صاحبِ کتاب ہوں وہاں ایک آدھ کتاب خواں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ کتابوں کی اشاعت بے جواز نہ ٹھہرے۔ مگر یہ جو ہمارے کرم فرما شاہد علی خاں صاحب ہیں، اِن کا خیال یہ ہے کہ اگر ہمارے کالم مکتبہ جامعہ سے کتابی صورت میں شائع نہ ہوئے تو ضائع ہو جائیں گے☆۔ خاں صاحب بڑے تجربہ کار ناشر ہیں اور دوسروں سے زیادہ اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ بعض تحریریں کتابی صورت میں شائع ہونے ہی کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔ ہم نے بہت سے ایسے شاعر دیکھے ہیں جو زندگی بھر مشاعرے لوٹتے ہیں اور جب اُن کا دیوان شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود لُٹ گئے۔ ایسے بے شمار دیوانوں کا ادب کی تاریخوں میں تو نہیں، کاغذ کے ضیاع کی تاریخوں میں ذکر ملتا

☆ زیرِ نظر کتاب کا ہندوستانی ایڈیشن فروری ۱۹۹۵ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

ہے۔ ہم نے خان صاحب کو اُن کے ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اُن کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ رشید حسن خان صاحب نے خان صاحبی کی کچھ ایسی دھاک بٹھا رکھی ہے کہ ہم ہر اُس شخص سے ڈرتے ہیں جس کے نام میں "خان" کا لاحقہ شامل ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں خان صاحب کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔

کالم نگاری ہم بہت عرصے سے کر رہے ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بُلوائے تو ہمارے کالموں کی مجموعی ضخامت ممتاز مفتی کے ناول "علی پور کا ایلی" سے کم نہیں ہوگی۔ اتنے بہت سے کالموں کو پڑھ کر انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے، حشر کے دن پھوہڑ عورتوں کو یہ سزا ملے گی کہ اُنھیں صرف وہی کھانے کھلائے جائیں گے جو اُنھوں نے خود پکائے ہوں۔ اِسی طرح کسی لکھنے والے کو جو بڑی سے بڑی سزا دی جا سکتی ہے وہ یہ ہو سکتی ہے کہ اُسے اُسی کی تحریریں پڑھوائی جائیں۔ ہم اِس سزا کے بھگتنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے۔ البتہ سزا کا دورانیہ کم کرنے کے لیے یہ طے کیا کہ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک کے آٹھ برسوں کے دوران ہفت روزہ "تکبیر" کراچی میں لکھے گئے کالموں میں سے کچھ کالم انتخاب کر لیے جائیں۔ اِن کالموں کو ہم نے جمع کیا اور اُن پر ایک نظر ڈالی۔ اندازہ ہوا کہ سبھی کالم سراپا انتخاب ہیں بشرطیکہ ناقابلِ انتخاب کالموں کا مجموعہ چھاپنا ہو۔

اِس مرحلے پر اردو کے منفرد نقاد مظفر علی سید نے ہماری دستگیری کی اور انتخاب کی ذمہ داری قبول کر لی۔ ہماری حوصلہ افزائی کے خیال سے اُنھوں نے فرمایا، کوئی مصنف اپنی تحریروں کا انتخاب خود نہیں کر سکتا کیوں کہ اُسے اپنی ہر تحریر "عالم میں انتخاب" اور آپ کو "کالم میں انتخاب" نظر آتی ہے۔ میں انتخاب کروں گا تو یہ نہیں دیکھوں گا کہ اچھا کالم کون سا ہے اور بُرا کون سا۔ میں تو اِس پر نظر رکھوں گا کہ کون سا کالم کم بُرا ہے اور کون سا زیادہ۔ انتخاب کا یہ کڑا معیار سید صاحب ہی کے بس کی بات ہے کیوں کہ اُن کی نگاہِ انتخاب خوبیوں سے زیادہ عیبوں کی قدردان ہے۔ اور پھر اِس معاملے میں وہ خاصے تجربہ کار بھی ہیں۔ اِس کا ثبوت نظیر صدیقی کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا وہ انتخاب ہے جو سید صاحب نے مرتب فرمایا تھا اور چند سال پہلے شائع ہو چکا ہے۔ شاید اِسی انتخاب کی وجہ سے لوگ بھول چکے ہیں کہ نظیر صدیقی صرف نقاد نہیں، طنز و مزاح میں بھی رواں ہیں۔ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ کسی نقاد کو اِس کی ضرورت نہیں کہ وہ تنقیدی مقالات کے ہوتے الگ سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھے۔

سید صاحب نے نہایت توجہ اور محنت سے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ بڑی محبت سے

ہمارے کالموں کو پڑھا۔ اُن تمام کالموں کو مسترد کر دیا جن میں اُن کی پسندیدہ شخصیات کو ہم نے مسترد کیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کے نزدیک وہ کالم بھی بے اعتبار ٹھہرا جو خود اُن کے اعزاز میں لکھا گیا تھا اور جس میں اُن کے وزیٹنگ کارڈ کو اُن کی واحد مستقل تصنیف قرار دیا گیا تھا اور تصنیف بھی ایسی جس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہوں۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے اِس کالم کی اشاعت کے بعد سید صاحب کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تنقید کی آزادی" بالآخر شائع ہو گیا۔ مزید دو مجموعے زیرِ طبع ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ہماری کالم نگاری کا کم از کم ایک مثبت نتیجہ بھی ظاہر ہوا ہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ سید صاحب کے مسترد کردہ کالموں کو بطور انتخاب شائع کر دیا جائے تاکہ اُن کی محنت اور ہماری ناکارکردگی کا دستاویزی ثبوت لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر کی طرح باقی رہ جائے۔ لیکن اِس قسم کے کالم تعداد میں بہت زیادہ تھے، لہٰذا دوسری قسم کے کالم ہی کتابی صورت میں محفوظ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اب ایک اور مشکل سامنے آگئی کہ اگر سید صاحب کے تمام منتخبہ کالم شائع کیے جائیں تو اُن کی ضخامت بھی قاری اور ناشر دونوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔ مجبوراً منتخبہ کالموں میں سے بھی تقریباً نصف حذف کرنے پڑے۔

اِن سب مرحلوں سے گزرنے کے بعد نظرِ ثانی کا مرحلہ آیا۔ دو چار کالم پڑھ کر ہی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہیں یا معنوی اغلاط۔ بہر حال ہم نے بڑی محنت سے کتابت کی غلطیاں دور کر دیں اور باقی ہر طرح کی اغلاط کو اصل کے مطابق باقی رہنے دیا تاکہ ہم پر اصل میں تحریف کا الزام نہ آئے۔ کتاب کے آخر میں "غلط نامہ" شامل کرنے کا ارادہ تھا مگر پھر خیال آیا کہ اردو کی کتابوں میں غلط نامہ شامل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ یہ تو خود غلط نامے کا نعم البدل ہوتی ہیں۔

Karachi
1995

خوشبو کے قلم سے

سخن ہائے ناگفتنی

خامہ بگوش

تحریروں کا انتخاب

مرتبہ

مظفر علی سید

فہرست

کالم نگار خامہ بگوش کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ اُن کی تحریریں اوّلاً کراچی کے ایک ہفت روزہ میں شائع ہونے کے بعد پاکستان، ہندوستان کے متعدد رسائل و جرائد اور اخبارات میں نقل ہوتی رہی ہیں۔ طنز و مزاح کے مخصوص اسلوب میں لکھے گئے یہ ادبی کالم اپنی گہری علمی بصیرت اور نکتہ سنجی کے باعث قریب و دور کی پوری اردو دنیا میں موضوعِ گفتگو رہے ہیں، اور آج بھی قارئین کی ایک بڑی تعداد ان کالموں کی کتابی صورت میں اشاعت کی منتظر نظر آتی ہے۔

خامہ بگوش کی تحریروں کے پہلے مجموعے (خامہ بگوش کے قلم سے) کی طرح یہ انتخاب بھی ممتاز نقاد مظفر علی سید کا مرتب کیا ہوا ہے۔ ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک کی تحریروں کا یہ انتخاب مرتب نے اصلاً ایک جلد کے لیے کیا تھا لیکن کتاب کی ضخامت کے پیشِ نظر بعد ازاں اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ اب یہ دونوں جلدیں ''سخن در سخن'' اور ''سخن ہائے ناگفتنی'' کے ناموں سے بیک وقت شائع کی جا رہی ہیں۔

سخن ہائے ناگفتنی

ACADEMY BAZYAFT

ISBN 969-5400-16-7
9 6954 00167

Pk. Rs. 200

سخن در سخن

خامہ بگوش

تحریروں کا انتخاب

مرتبہ

مظفرؔ علی سیّد

فہرست

کالم نگار خامہ بگوش کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ ان کی تحریریں اولاً کراچی کے ایک ہفت روزہ میں شائع ہونے کے بعد پاکستان، ہندوستان کے متعدد رسائل و جرائد اور اخبارات میں نقل ہوتی رہی ہیں۔ طنز و مزاح کے مخصوص اسلوب میں لکھے گئے یہ ادبی کالم اپنی گہری علمی بصیرت اور نکتہ سنجی کے باعث قریب و دور کی پوری اردو دنیا میں موضوعِ گفتگو رہے ہیں، اور آج بھی قارئین کی ایک بڑی تعداد ان کالموں کی کتابی صورت میں اشاعت کی منتظر نظر آتی ہے۔

خامہ بگوش کی تحریروں کے پہلے مجموعے (خامہ بگوش کے قلم سے) کی طرح یہ انتخاب بھی ممتاز نقاد مظفر علی سید کا مرتب کیا ہوا ہے۔ ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء تک کی تحریروں کا یہ انتخاب مرتب نے اصلاً ایک جلد کے لیے کیا تھا لیکن کتاب کی ضخامت کے پیشِ نظر بعد ازاں اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ اب یہ دونوں جلدیں "سخن در سخن" اور "سخن ہائے ناگفتنی" کے ناموں سے بیک وقت شائع کی جا رہی ہیں۔

AB
ACADEMY BAZYAFT

سخن در سخن

مرتبہ
مظفر علی سید

ISBN 969-8400-159
9 6954 00159
Pk. Rs. 200

سخن ہائے گسترانہ

خامہ بگوش کی منتخب تحریریں

Karachi
2007

ڈاکٹر انور سدید

☆——☆——☆

ترتیب

سن تو سہی

Islamabad
March 2008

فہرست

مشفق خواجہ نے خامہ بگوش کے روپ میں جرأت مندی سے لکھا، قلم سے نوکِ سناں کا کام لیا اور ایک لازوال کردار، استاد لاغر مراد آبادی بھی پیدا کیا جو مشفق خواجہ کا ہمزاد تھا لیکن ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو چشمِ نگراں سے دیکھتا اور ان پر بے لاگ تبصرہ کرنے کا کوئی موقعہ فروگزاشت نہیں کرتا تھا۔ مشفق خواجہ (خامہ بگوش) اب ہم میں موجود نہیں لیکن "خامہ بگوش کے قلم سے"..... "سخن در سخن"..... اور "سخن ہائے ناگفتنی" جیسی کتابوں کی وجہ سے وہ ادب کی دنیا سے کہیں غیر حاضر شمار نہیں ہوں گے اور بیسویں صدی میں نثر کے مزاح نگاروں..... رشید احمد صدیقی، شوکت تھانوی، ابنِ انشاء، ابراہیم جلیس، مجید لاہوری، کنہیا لعل کپور، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، شفیق الرحمٰن..... محمد خالد اختر، کرنل محمد خان، سید ضمیر جعفری اور مشتاق احمد یوسفی کے ساتھ زندہ رہیں گے۔

متذکرہ تین کتابیں جناب مظفر علی سید کی نظرِ انتخاب کا نتیجہ تھیں اور مشفق خواجہ صاحب کی زندگی میں اشاعت کی منزل سر کر چکی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد جناب خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے ان کے تمام کالموں کی تلاش و جستجو کا فریضہ انجام دیا۔ ایک مجموعہ "سخن ہائے گسترانہ" کے عنوان سے شائع کیا جس کا پیش لفظ لکھنے کا شرف مجھے حاصل ہوا۔ طارق خواجہ صاحب نے ہی مجھے "مرتب" کے اعزاز سے بھی سرفراز فرمایا۔ "سخن در سخن" کے سلسلے کی پانچویں کتاب اب پیش کی جارہی ہے تو میں اس افتخار پر نازاں ہوں کہ اس کا پیش لفظ لکھنے کے لیے بھی مجھے منتخب کیا گیا۔ مجھے اپنے محسن دوست مشفق خواجہ کے ساتھ مزید وقت گزارنے کا موقعہ دیا گیا۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین

ڈاکٹر انور سدید

Rs. 395/-

ISBN-13: 978-969-8917-54-8
ISBN-10: [illegible]

www.poorab.com.pk

خامہ بگوشیاں

مشفق خواجہ کے ادبی کالم

Islamabad
2010

مرتبین : ڈاکٹر انور سدید
خواجہ عبدالرحمٰن طارق

اکادمی بازیافت

Khama Bagoshiyan

Mushfiq Khwaja's Literary Columns

مشفق خواجہ کا احساسِ مزاح لطیف بھی ہے اور تیکھا بھی۔ یہ کانٹے کی اس چبھن کی طرح ہے جس سے خون سطح پر نمودار نہیں ہوتا لیکن چبھن کے بعد ایک کھلا ہوا خوشبودار پھول ہاتھ میں آجاتا ہے۔ مشفق خواجہ نے طنز و مزاح سے ماحول کی یکسانیت اور فضا کے جمود کو توڑنے کا کام لیا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ان کے اس عمل سے شخصیت مجروح نہیں ہوتی۔

مشفق خواجہ اردو کے شاید واحد مزاح نگار ہیں جنہوں نے ادب، ادیب اور معاشرے کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کے ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی۔ وہ ادیب کو معاشرے کا حساس ترین فرد تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں ادیب دیدۂ بینائے قوم ہے اور معاشرے میں دکھ کہیں بھی ہو ادیب کی آنکھ اس دکھ پر آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہے اور وہ نظم، غزل، افسانہ وغیرہ لکھنے پر بے تاب ہو جاتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں صورت حال اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے۔ آج کا ادیب ذہنی کشمکش اور تصادم سے گزرنے کے بجائے مفاہمت، مصلحت اور سہل انگاری کا شکار ہے۔ ادبی فضا کے اس تضاد نے مشفق خواجہ کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ "خامہ بگوش" نے اس کالم میں ادبی معاشرے کی ناہمواریوں، شہرت پسند اور جعلی ادیبوں کی غیر ادبی حرکتوں، سرکاری ادبی اداروں اور "افسر ادیبوں" کی بد انتظامیوں اور کتابوں کے محاسن و معائب کو دیانت داری اور غیر جانبداری سے نشان زد کیا۔

Rs. 275/-

ISBN 978-969-8917-90-6

9 789698 917906

www.poorab.com.pk

فہرست

مزید خامہ بگوشیاں

(ادبی کالم)

مشفق خواجہ

مرتبین:

ڈاکٹر انور سدید

خواجہ عبدالرحمٰن طارق

مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

فہرست

مزید خامہ بگوشیاں

مشفق خواجہ

مشفق خواجہ کا احساسِ مزاح لطیف بھی ہے اور سبک بھی۔ یہ کانٹے کی اس چبھن کی طرح ہے جس سے خون سطح پر نمودار نہیں ہوتا لیکن چبھن کے بعد ایک کھلا ہوا خوشبودار پھول ہاتھ میں آ جاتا ہے۔ مشفق خواجہ نے طنز و مزاح سے ماحول کی یکسانیت اور فضا کے جمود کو توڑنے کا کام لیا ہے لیکن خوبی یہ ہے کہ ان کے اس عمل سے شخصیت مجروح نہیں ہوتی۔

مشفق خواجہ اردو کے شاید واحد مزاح نگار ہیں جنہوں نے ادب، ادیب اور معاشرے کی ناہمواریوں کو طنز و مزاح کے ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی۔ وہ ادیب کو معاشرے کا حساس ترین فرد تصور کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں ادیب دیدۂ بینائے قوم ہے اور معاشرے میں دکھ کہیں بھی ہو ادیب کی آنکھ اس دکھ پر آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہے اور وہ نظم، غزل، افسانہ وغیرہ لکھنے پر بے تاب ہو جاتا ہے۔ لیکن عملی زندگی میں صورت حال اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے۔ آج کا ادیب ذہنی کشاکش اور تصادم سے گزرنے کے بجائے مفاہمت، مصلحت اور سہل انگاری کا شکار ہے۔ ادبی فضا کے اس تضاد نے مشفق خواجہ کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔

www.nla.gov.pk

Karachi
2010

جوش اور خامہ بگوش

مشفق خواجہ کی خامہ بگوشیاں

مرتب
خواجہ عبدالرحمن طارق

فہرست

مشفق نامے

(مکتوبات مشفق خواجہ بنام محمد عالم مختار حق)

جلد اول

خطوطِ مُشفق

مشفق خواجہ کے خطوط ڈاکٹر طیب منیر کے نام

Islamabad
2007

مرتب

ڈاکٹر طیب منیر

حرفِ اوّل

یہ مجموعہ مشفق خواجہ (۱۹ر دسمبر ۱۹۳۵ء-۲۱ر فروری ۲۰۰۵ء) کو یاد کرنے اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے، بقول فیض:

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں

ابھی ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ استاذی ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے مخزن ۹ کے لیے مشفق خواجہ پر مضمون طلب کیا۔ فوری طور پر مضمون نہ بن پڑا[1]، اس لیے میں نے اپنے نام مشفق خواجہ کے نو خطوط حواشی و تعلیقات کے ساتھ تیار کر کے استاذِ محترم کو پیش کر دیے جو اگست ۲۰۰۵ء میں مخزن ۹ میں چھپ گئے۔ اخبار اُردو اسلام آباد نے ستمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں انھی خطوط کو مکرر شائع کیا۔ متعدد احباب نے انھیں دل چسپ پایا۔ برادر پروفیسر سلیم منصور خالد صاحب نے تجویز دی، بلکہ اصرار کیا کہ باقی خطوط بھی اسی طرح شائع کر دیے جائیں۔

اپریل ۲۰۰۵ء میں کراچی جانا ہوا۔ مکالمہ کے دفتر میں مبین مرزا صاحب سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب کا تذکرہ ناگزیر تھا، انھوں نے مکالمہ کے لیے مشفق خواجہ پر کچھ لکھنے کی فرمایش کی۔ طے ہوا کہ مَیں چند خطوط مرتب کر کے دے دوں گا۔ ۳۸ خطوط مع مختصر حواشی و تعلیقات ارسال کیے گئے، جو (سوا سال کے انتظار کے بعد) اگست ۲۰۰۶ء میں مکالمہ ۱۵ کے ذریعے منظرِ عام پر آئے۔ ان کی تمہید میں مَیں نے لکھا تھا: 'راقم کے پاس مرحوم کے ڈیڑھ سو خط محفوظ رہ گئے۔ یہ سارے کے سارے تو شائع کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان میں سے چند ایک رسمی نوعیت کے ہیں۔ مزید کچھ خطوط آیندہ کسی موقعے پر شائع کرنے کا ارادہ ہے۔'

۱۔ وفات کے تین چار روز بعد، مَیں نے شعبۂ اردو اورینٹل کالج کے تعزیتی اجلاس میں ایک مختصر سا تاثراتی مضمون پڑھا تھا، مگر یہ نا تمام تھا اور اسے شائع کرانے میں مجھے تامل تھا۔

زیرِ نظر مجموعہ اسی ارادے کو روبہ عمل لانے کی کوشش ہے۔ اُس وقت تو مَیں نے لکھ دیا کہ سارے کے سارے [خطوط] شائع کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن بعدازاں مجھے احساس ہوا (اور مَیں ذہناً یکسو ہو گیا) کہ سارے کے سارے خطوں کو شائع کر دینا ضروری ہے۔ بے شک ان میں سے بہت سے خطوں کی نوعیت رسمی ہی ہے مگر یہ رسمی خط بھی مشفق خواجہ کی یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اُن جیسے باکمال شخص کی ہر یادگار کو محفوظ کر لینا ضروری ہے۔ بالیقین تاریخِ ادب کے حوالے سے بھی یہ ایک مفید اور بامعنی عمل ہوگا۔

اس مجموعے میں ۱۴۳ خطوط پیش کیے جا رہے ہیں۔ ایک خط (مرقومہ مورخہ ۸ جنوری ۲۰۰۲ء) نجی اور شخصی موضوع پر ہے، اس لیے اُسے شامل نہیں کیا جا رہا۔ اس طرح راقم کے نام مشفق خواجہ کے دستیاب خطوں کی تعداد ۱۴۴ بنتی ہے۔ ضمیمے میں ۶ ایسے خطوط شامل ہیں، جو اپنی جگہ اہم ہیں یا معنوی اعتبار سے ان کا ربط اس مجموعے سے بنتا ہے۔

حواشی و تعلیقات سے خطوں کا متن واضح اور روشن تر ہوتا ہے اور کہیں کہیں تو حواشی دینا ناگزیر ہوتا ہے۔ زیرِ نظر خطوں کے حواشی و تعلیقات میں ممکنہ حد تک اختصار برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خواجہ صاحب کے ایسے قریبی احباب کا تعارف صفحہ نمبر ۴۱ اور ۴۲ پر دیا گیا ہے، جن کا ذکر خطوں میں کئی جگہ آیا ہے۔

متونِ خطوط کو اصل کے مطابق نقل کیا گیا ہے۔ بعض حصوں سے چند الفاظ یا جملے اور تین چار مقامات پر پورے پورے پیراگراف حذف کر دیے گئے ہیں۔ خواجہ صاحب اپنے بے تکلف اور قریبی دوستوں کو بعض امور و مسائل کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے لکھ دیا کرتے تھے۔ اب ان کی وفات کے بعد، ایسے 'آف دی ریکارڈ' جملوں یا حصوں کی اشاعت روا نہیں۔ ممکن ہے، اسے 'اصولِ تحقیق و تدوین' یا دیانت، کے خلاف سمجھا جائے، لیکن جہاں کسی کی دل آزاری یا فسادِ خلق کا اندیشہ ہو یا خود مکتوب نویس کی رسوائی کا خدشہ، وہاں 'راستیِ فتنہ انگیز' سے اجتناب بہتر ہے۔

مشفق خواجہ محقق تھے اور اصولِ املا میں اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں، اُن کے ہاں املا کا شعور اس قدر واضح نہ تھا، چنانچہ وہ 'تمغا' کو 'تمغہ' لکھتے تھے اور 'لیے' کو 'لئے'۔ ابتدائی زمانے میں وہ ہر جگہ اِمالے کا اہتمام بھی نہیں کرتے تھے۔ زیرِ نظر مکاتیب کی کتابت انھی کے املا میں کی گئی ہے۔ دو تین مقامات پر وہ جلدی میں اپنے ہی اصولِ املا کی خلاف ورزی کر گئے، مثلاً انھوں نے 'مل گیا' کو ایک جگہ اس طرح لکھ دیا: 'ملگیا'، ایک جگہ 'لیے' کو 'لئے' لکھ دیا، ایک خط

میں 'جوں ہی' کے بجائے 'جونہی' لکھ دیا۔ خطوں میں خواجہ صاحب کی ایسی نادانستہ غلط املا کو درست صورت میں لکھا گیا ہے۔

ایک موقع پر خواجہ صاحب نے مجھے املا کے سات اصول ایک کاغذ پر لکھ کر بھیجے تھے۔ کتاب ہذا میں خط نمبر ۱۶۱ سے ملحق اس کا عکس دیا جا رہا ہے۔ یہ ساتوں اصول رشید حسن خاں کی سفارشات کے عین مطابق ہیں، تاہم بعض الفاظ کے املا میں خواجہ صاحب کو رشید حسن خاں سے اختلاف تھا، اس لیے انھوں نے کہیں کہیں خاں صاحب کی املا کو قبول نہیں کیا، مثلاً وہ رشید حسن خاں کے 'گذشتہ'، 'اڈیشن'، 'اوارڈ'...... کے برعکس 'گزشتہ'، 'ایڈیشن'، 'ایوارڈ' لکھتے ہیں، لیکن املا کے زیادہ تر اصولوں اور قاعدوں میں وہ خاں صاحب اور ترقی اردو بیورو، دہلی کی املائی سفارشات کے قائل تھے۔ ان کے اور رشید حسن خاں کے املا میں اختلافات نسبتاً کم اور مماثلتیں کہیں زیادہ ہیں۔

یہ خواجہ صاحب کا انکسار تھا یا نفیِ ذات کی ایک صورت کہ وہ رائٹنگ پیڈ پر اپنا نام کبھی نہیں چھپواتے تھے، صرف مکان کا پتا چھپا ہوتا تھا۔ کبھی کبھار خط مطبوعہ پیڈ کے بجائے سادہ کاغذ پر لکھنا پڑتا تو اوپر دائیں طرف اپنے قلم سے مکان کا پتا لکھ دیتے۔ زیرِ نظر ۲۴۳ خطوں میں ایسا فقط چند ایک خطوں میں ہوا ہے، چنانچہ ایسے خطوط کی پیشانی پر پتا بھی کتابت کرایا گیا ہے کہ یہ ان کی دست نوشت تحریر میں ہے، لیکن جن خطوں میں پتا چھپا ہوا ہے تو وہ متنِ خط کا حصہ نہیں، اس لیے ایسے خطوط میں پیشانی پر پتا کتابت نہیں کیا گیا۔

خواجہ صاحب خط کے آخر میں دستخط کر کے اور تاریخ لکھ کر دائیں جانب مکتوب الیہ کا نام اور شہر کا نام لکھ دیتے تھے۔ ان کی وضع داری دیکھیے کہ اجنبیوں، طلبہ اور خُردوں کے نام کے ساتھ بھی 'بخدمتِ گرامی' کا لاحقہ استعمال کرتے۔ وضع داری کی بات آئی تو بتاتا چلوں کہ ابتدائی برسوں میں راقم کے نام ان کے خطوط 'محترمی و مکرمی' سے شروع ہوتے اور 'آپ کا خیر اندیش' پر ختم ہوتے تھے، لیکن جوں جوں باہمی تعلقات میں اضافہ ہوتا گیا تو 'محترمی و مکرمی' کے بجائے وہ 'برادرِ عزیز و مکرم' لکھنے لگے اور آخر میں کبھی 'خیر اندیش' اور کبھی صرف 'آپ کا' لکھنے پر اکتفا کرتے تھے۔

نمونے کے طور پر مشفق خواجہ کے دست نوشت چند ایک مکاتیب کے عکس بھی متون کے ساتھ شائع کیے جا رہے ہیں۔ راقم نے خواجہ صاحب کے نام اپنے ۴ خطوں کے عکس بھی شاملِ کتاب کر دیے ہیں اور یہ بھی جناب عبدالرحمٰن طارق کی فرمائش اور اصرار پر...... جب انھیں معلوم ہوا کہ میں خواجہ مرحوم کے خطوط یکجا شائع کر رہا ہوں (وہ مخزن ۹ میں شائع شدہ نو خطوط

دیکھ چکے تھے) تو انھوں نے مشفق خواجہ کے ذخیرۂ مکاتیب سے میرے جملہ خطوط کے عکس بنوا کر بھجوا دیے اور یہ فرمایش کی کہ 'ان خطوط کو بھی خواجہ صاحب کے خطوں کے ساتھ شائع کیا جائے، اس طرح بیشتر مقامات پر حواشی کی ضرورت بھی نہیں رہے گی'۔ خواجہ طارق صاحب نے بعد ازاں بذریعہ ٹیلی فون اور پھر ملاقات پر بھی اس پر اصرار کیا، مگر مَیں ان کی اس فرمایش کی تعمیل نہیں کر سکا، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں اپنے خطوط کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ مشفق خواجہ کے مکاتیب کے ساتھ شائع کروں۔ دوسرے یہ خود نمائی کی ایک صورت بنتی ہے۔

یہ معلوم ہے کہ خواجہ صاحب خط لکھنے اور جواب دینے میں مستعد اور فعال تھے اور سیکڑوں لوگوں سے ان کی خط کتابت تھی۔ وہ اپنے نام آمدہ خطوط کو نمبر شمار لگے ہوئے، الگ الگ بڑے لفافوں میں محفوظ رکھتے تھے۔ (راقم کے خطوط لفافہ نمبر ۴۴۱ میں رکھے جاتے تھے)۔ خطوط کے نجی ذخیروں میں مشفق خواجہ کے ذخیرۂ مکاتیب جیسا بڑا، قیمتی اور متنوع ذخیرہ کہیں بھی نہیں ملے گا۔

خطوط کسی شخص کو سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں، اسی لیے مشفق خواجہ سے قربت و محبت اور 'ما و شما آشنا بود' کا دعویٰ رکھنے والے احباب اور دوستوں سے میری گزارش ہے کہ مرحوم سے ہماری محبت اور تعلق خاطر کا ادنیٰ تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے اپنے نام ان کے مکاتیب شائع کر دیں، مگر خطوں پر مختصر توضیحات ضروری ہیں۔ خواجہ صاحب کے بعض نیاز مندوں نے خطوط بلا حواشی شائع کرا دیے ہیں، شاید ان کی مصروفیت آڑے آئی (یا سہولت پسندی؟)، تاہم بلا حواشی، خطوں کی اشاعت بھی فائدے سے خالی نہیں۔

باری تعالیٰ مشفق خواجہ کی خدمات (= نیکیوں) کو قبول کرے اور اُن کی کوتاہیوں اور لغزشوں سے صرف نظر کرتے ہوئے انھیں اپنے ان 'عاشقانِ پاک طینت' میں شامل کرے، جو اس کی رحمت کے مستحق ہوتے ہیں۔ یقیناً وہ اُنھی لوگوں میں سے تھے، جن کے بارے میں میر تقی میر کہہ گئے ہیں:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

رفیع الدین ہاشمی

۲۰ر دسمبر ۲۰۰۷ء

مکاتیبِ

مُشفق خواجہ

بنام

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مکتوبات

مشفق خواجہ

بہ نام نظیر صدیقی

مرتبہ: خواجہ عبدالرحمن طارق

ادبیات

مراسلت:

مشفق خواجہ - صدیق جاوید

Lahore
2011

مرتبہ

ڈاکٹر صدیق جاوید

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور

مکتوباتِ مشفق خواجہ

بنام

ڈاکٹر مختار الدین احمد

ترتیب و پیشکش

ڈاکٹر سید حسن عباس

رُقعاتِ مشفق خواجہ

بنام

ڈاکٹر سلیم اختر : ڈاکٹر طاہر تونسوی

Alqamar,
lahore
2012

مرتب : خالد ندیم

اکابرِ صحافت ۔ ۲

2005

صیغہ مطبوعاتی ابلاغ

شعبہ ابلاغِ عامہ، جامعہ کراچی

خامہ بگوش ــ ایک مطالعہ

Ikadmy
Bazyaft,
Karachi
2004

وحیدالرحمٰن خان

معروف محقق، شاعر اور نقاد مشفق خواجہ نے گزشتہ کئی برسوں کے دوران مختلف اخبارات و جرائد میں اپنی طنزیہ اور فکاہیہ تحریریں شائع کرائی ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح کی ایک دیرینہ روایت کو نبھاتے ہوئے اپنا ایک قلمی نام ''خامہ بگوش'' رکھ لیا۔ پردے میں رہ کر انھوں نے ادب کے متعدد مسائل پر بہت شگفتہ اور مقصدی پیرائے میں کالم لکھے۔ ان کالموں کا ایک انتخاب مظفر علی سید نے ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کے زیر عنوان کئی برس پہلے مرتب کیا تھا اور اب حال ہی میں مظفر علی سید کے منتخب کردہ خامہ بگوش کے کالموں کے دو نئے مجموعے ''سخن در سخن'' اور ''سخن ہائے ناگفتنی'' منظر عام پر آئے ہیں۔ خامہ بگوش کے یہ کالم بہت مقبول ہوئے، یہاں تک کہ پاکستان سے زیادہ ہندوستان کے ادبی پرچوں نے انھیں فخر و انبساط کے ساتھ شائع کیا۔ خامہ بگوش کی ان فکاہیہ تحریروں کو بنیاد بنا کر وحید الرحمن خان نے ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھا ہے اور بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خامہ بگوش ''مزاح برائے مزاح'' کے نہیں ''مزاح برائے اصلاح'' کے قائل ہیں۔ مقالہ نگار نے ابتدا ہی میں ایک اہم نکتہ بیان کر دیا ہے کہ:

یہ کالم دراصل طنز و مزاح، تنقید اور تحقیق کا امتزاج ہیں۔ اور ان کا مطالعہ ان تین حوالوں سے کرنا چاہیے۔

وحید الرحمن خان نے ''خامہ بگوش ——— ایک مطالعہ'' میں ان تینوں زاویوں کا احاطہ کیا ہے اور تحقیق و تبصرے کا حق ادا کر دیا ہے۔ وحید الرحمن خان کو بھی طنز و مزاح اور شگفتہ نگاری سے علاقہ ہے اور وہ تحقیق و تنقید پر سنجیدہ نگاہ بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے ان کا یہ تحقیقی مقالہ طنز و مزاح اور سنجیدہ تحریروں کے محاکمے کا ایک خوش گوار مرقع بن گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مشفق خواجہ (خامہ بگوش) کی تحریروں سے دلچسپی رکھنے والے مقالہ نگار وحید الرحمن خان کی اس تحقیقی اور تنقیدی کاوش کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

پروفیسر سحر انصاری

AB
ACADEMY BAZYAFT

وحید الرحمٰن خان

خامہ بگوش ـــ ایک مطالعہ

فہرست

مشفق خواجہ: فن اور شخصیت

2008

مرتب

محمد اسلام نشتر

مقتدرہ قومی زبان

پاکستان

مشفق خواجہ......ایک کتاب

ڈاکٹر انور سدید

Islamabad
2008

فہرست

سخن در سخن

کالم

مشفق خواجہ اُردو دنیا کی ایک نامور شخصیت تھے۔ وہ جستجوئے صداقت کرانے والے محقق تھے، پختہ نظری سے پیش کرنے والے نقاد تھے، تازہ فکر شاعر تھے، تخلیقی شگفتہ نگار تھے، اور سب سے اہم یہ کہ اُردو زبان وادب کی شمع کی لو بلند رکھنے اور اس میدان میں نئے لکھنے والوں کو راغب اور پرانے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے ادیب تھے۔ ان کا وسیع کتب خانہ کم وبیش چالیس ہزار کتابوں، مخطوطوں اور قیمتی دستاویزات پر مشتمل تھا۔

زیرِ نظر کتاب بنیادی طور پر ایک یادنامہ ہے، جس میں مشفق خواجہ کی شاعری، تحقیق و تنقید اور مزاح نگاری پر تنقیدی مضامین، خواجہ صاحب کے چند منتخب کالم جو اُنھوں نے انور سدید کی کتابوں پر لکھے اور خود انور سدید کے چند کالم جو اُنھوں نے خواجہ صاحب پر لکھے تھے، شامل ہیں۔ ان کے خطوط کے چند مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں، لیکن ان کی ادبی شخصیت اور اصناف فن پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر انور سدید پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد مکمل طور پر ادب سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی معروف کتاب ''اُردو ادب کی تحریکیں'' ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی شعور کا اندازہ اُن کی کتب: اُردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اُردو افسانے کی کروٹیں، اُردو نظم کے عناصر اربعہ، اقبال کے کلاسیکی نقوش، وغیرہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ آج کل روزنامہ نوائے وقت میں کالم لکھ رہے ہیں۔ ان کے کالموں میں بھی ان کے ادبی مزاج کی جھلک نظر آتی ہے۔

Rs. 160/-

ISBN-13: 978-969-8917-57-9
ISBN-10: 969-8917-57-8

051-5814796

www.poorab.com.pk

فہرست

خراج تحسین

مضامین

نذرانۂ عقیدت

کس قیامت کے یہ نامے

مکتوبات مشفق خواجہ

❖❖❖

سید معراج جامیؔ، کراچی

خواجہ ادیب نواز

مشفق خواجہ کے انتقال کو تین سال گزر گئے، مگر اب بھی یقین نہیں آتا کہ ہمارے درمیان مشفق خواجہ موجود نہیں۔ آج بھی کبھی کبھی فون اٹھاتے وقت ایسا لگتا ہے کہ دوسری جانب سے مشفق خواجہ کی دھیمی اور ملائم آواز آئے گی۔ مشفق خواجہ مجھے کبھی کبھی فون کرتے تھے، فون پر ان کا مخصوص لفظ ''فرمایئے'' بھی اب تک کانوں میں گونج رہا ہے۔ میری ان سے نیاز مندی کا واقعہ بلکہ مفصل واقعہ اسی کتاب میں شامل میرے مضمون میں ہے۔

مشفق خواجہ کی رحلت کے بعد یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی اور اس کے تحت جاری ہونے والے ماہنامہ ''پرواز'' کے ارباب نے فیصلہ کیا کہ پرواز کا ایک ضخیم پرواز نمبر شائع کیا جائے۔ اس کام کے لیے ہم تینوں یعنی صابر ارشاد عثمانی صاحب، ساحر شیوی صاحب اور خاکسار نے بیڑہ اٹھایا۔ نئے اور تازہ مضامین کے حصول کے لیے عثمانی صاحب کی کاوشیں زیادہ ہیں، تاہم مضامین کے آنے میں ایک سال گزر گیا۔ اگرچہ بہت سے احباب نے ہم سب کی آواز پر لبیک کہا اور فوراً اپنے تاثراتی مضامین بھیجے مگر کچھ احباب نے مضامین بھیجنے میں وقت لیا۔

اس کتاب میں دراصل دو کتاب شامل ہیں۔ مشفق خواجہ کے برادرِ خرد خواجہ عبدالرحمٰن طارق صاحب سے بھی میری نیاز مندی خواجہ صاحب کی رحلت کے بعد شروع ہوئی، مگر ان کی محبت، خلوص اور اپنائیت نے مجھے خواجہ صاحب کے حسنِ خلوص اور حسنِ سلوک کی یاد دلا دی۔ طارق صاحب بھی مجھ سے ویسے ہی خلوص سے ملتے ہیں جس خلوص سے خواجہ صاحب ملتے تھے۔ طارق صاحب کی کوششوں سے خواجہ صاحب کی بیشتر تحریریں، پاکستان کے مختلف ناشروں کے تعاون سے کتابی شکل میں آ گئی ہیں۔ اس طرح مشفق خواجہ کا سرمایۂ علمی محفوظ ہو رہا ہے، اس کے لیے خواجہ طارق صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میرے نزدیک تو خواجہ طارق صحیح معنوں میں مشفق خواجہ کے جانشین ثابت ہوئے ہیں۔

خواجہ طارق امریکا میں رہتے ہیں اور تقریباً ہر سال پاکستان آتے ہیں، مشفق خواجہ کی رحلت کے بعد ان کا پاکستان آنا تواتر سے ہونے لگا ہے۔ غالباً سال بھر پہلے طارق صاحب نے مجھے ساقی فاروقی اور مشفق خواجہ کے مابین ہونے والے خطوط کی نقل دی کہ آپ اس کتاب کو چھاپ سکتے ہیں۔ میں نے شکریہ کے ساتھ وہ خطوط حاصل کیے اور اسے کمپوز کرانے کے بعد کتابی شکل میں ترتیب دینے لگا۔ اسی دوران یہ فیصلہ ہوا کہ پرواز کے حوالے سے جو مضامین مشفق خواجہ پر آئے ہیں، اسے بھی کتابی شکل میں شائع کیا جائے کیونکہ رسالوں کے خصوصی نمبر کی اہمیت اپنی جگہ مگر کتاب کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہے تو پھر میں نے ان خطوط کو بھی اسی کتاب میں شامل کر دیا۔ اس طرح اس ایک کتاب میں آپ کو دو کتابوں کا سواد ملے گا۔ میں اس کے لیے بار دگر خواجہ عبدالرحمٰن طارق صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پرواز چونکہ ماہنامہ ہے، اس لیے ایک شمارے کی اشاعت کے بعد دوسرے شمارے کی تیاری میں فوراً مصروف جانا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ الحمد اللہ پرواز کی باقاعدہ اشاعت کو سات برس ہو گئے، اس کا ایک بھی شمارہ کبھی ناغہ نہیں ہوا اور نہ ہی وہ کبھی تاخیر کا شکار ہوا۔ اس لیے کتاب کی تیاری میں مزید وقت گزرتا چلا گیا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اب مشفق خواجہ پر تمام مضامین "متعلقاتِ مشفق خواجہ" کے نام سے آپ کے پیشِ نظر ہے۔ اس میں مشفق خواجہ پر لکھے گئے مضامین نئے ہیں، البتہ دو چار مطبوعہ مضامین ایسے ہیں جن کو ہم نے ان کی شگفتگی، بے ساختہ پن اور دلچسپی کی وجہ سے قند مکرر کے طور پر شامل کیا ہے۔ یہ ایسے مضامین ہیں جو مشفق خواجہ کے بے انتہا چاہنے والوں نے لکھے ہیں۔ ان مضامین میں بقول شاعر ع ...... کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے
اس لیے ان سے بہتر مضامین مکرر اس لیے نہ لکھے جا سکیں کہ کہنے والوں نے ان کی اور اپنے دل کی سب باتیں لکھ دی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مشفق خواجہ کے تعلق سے یہ کتاب آپ کو پسند آئے گی۔

متعلقاتِ مشفق خواجہ

مرتبین: ساحرؔ شیوی، صابر ارشاد عثمانی، سید معراج جامیؔ

یورپین اردو رائٹرز سوسائٹی ، لندن

47, Sutton Garden, Sundon Park, Lutombeds LU3 3AF, UK.
53, Leigham Vale, London SW16 2JQ, UK.
P.O. Box No. 17667, Karachi-75300, Pakistan.

1985

مشفق خواجہ - ایک مطالعہ

مرتبہ

خلیق انجم

ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مینجنگ اڈیٹر: شاہد علی خاں
اڈیٹر: ولی شاہجہاں پوری
مہمان اڈیٹر: خلیق انجم

جلد نمبر ۲۵
ضمیمہ شمارہ نمبر ۱۲ دسمبر ۸۵ء
قیمت سالانہ: ۳۰/= روپے
فی پرچہ: ۲/۵۰ روپے
غیر ممالک کے لیے: ۱۰۰/= روپے

تقسیم کار
صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دلی 110025
شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی 110006
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلی بار: دسمبر ۸۵ء
اس شمارے کی قیمت: 30/=

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج، نئی دہلی ۲ میں چھپوا کر شائع کیا۔

فہرست

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

مشفق خواجہ نمبر

قیمت: ۷۵ روپے

بانی: بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

[ج]اری شدہ: پاکستان میں ۱۹۴۸ء

— ادارۂ تحریر —

ادا جعفری

جمیل الدین عالی

— مدیر —

ادیب سہیل

— بدلِ اشتراک —

فی پرچہ ———— ۱۰ روپے

سالانہ عام ڈاک سے —— ۱۱۰ روپے

سالانہ رجسٹری سے —— ۲۳۰ روپے

— بیرونِ ملک —

سالانہ عام ڈاک سے ۱۰ پونڈ/۱۷ ڈالر

سالانہ ہوائی ڈاک سے ۱۵ پونڈ/۲۵ ڈالر

انجمن ترقیِ اردو پاکستان

شعبۂ تحقیق

ڈی-۱۵۹، بلاک ۷، گلشنِ اقبال

کراچی ۷۵۳۰۰

فون: ۴۸۱۱۴۰۶ - ۴۹۷۳۲۹۶

مضمون نما

مشفق خواجہ نمبر، قیمت: پچھتر روپے

مشفق خواجہ اور بیگم آمنہ مشفق

مشفق خواجہ، جناب جوش ملیح آبادی کے ساتھ

مشفق خواجہ ڈاکٹر مختار الدین احمد کے ساتھ

قومی زبان

مشفق خواجہ نمبر

Feb 2006

فہرست

مُشفقِ من خواجہ من

اس سرا میں نہیں قیام بہت
زندگی مختصر ہے کام بہت

Lahore
2006

مرتب:
محمد عالم مختارِ حق

BOOKMAN

کتاب

نیشنل بک فاؤنڈیشن

مشفق نامے

(مکتوبات مشفق خواجہ بنام محمد عالم مختار حق)

جلد اول

مشفق خواجہ
(احوال و آثار)

مقالہ پی ایچ۔ ڈی اردو (ریگولر)

سیشن ۲۰۰۲ء ____ ۲۰۰۶ء

مقالہ نگار

محمود احمد

متعلم پی ایچ۔ ڈی اردو، رول نمبر ۵

اورینٹل کالج

جامعہ پنجاب، لاہور

نگران

ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر

پروفیسر شعبہ اردو،

اورینٹل کالج

جامعہ پنجاب، لاہور

مشفق خواجہ
(احوال و آثار)

مقالہ پی ایچ۔ڈی اُردو (ریگولر)

سیشن ۲۰۰۳ء ــــــــ ۲۰۰۶ء

مقالہ نگار

محمود احمد

متعلم: پی ایچ۔ڈی اُردو، رول نمبر ۵

اوری اینٹل کالج

جامعہ پنجاب، لاہور

نگران

ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر

پروفیسر، شعبۂ اُردو

اوری اینٹل کالج

جامعہ پنجاب، لاہور

پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

سرگذشتِ الفاظ

احمد دین

سرگذشتِ الفاظ

احمد دین

مرتّب

خواجہ عبدالرحمٰن طارق

پورب اکادمی، اسلام آباد

یادِ ایام

روزنامچہ

[۱۹۲۹ء_۱۹۳۷ء]

خواجہ عبدالوحیدؒ

مرتبہ

مشفق خواجہ مرحوم

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ

جامعہ کراچی

راشد اشرف
L-2,Block-13-D-1,Adjacent Zuberi Family Park,
Gulshan Iqbal,KARACHI (Pakistan)

مشفق خواجہ۔ اس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ

کراچی کے علاقے ناظم آباد میں ریلوے لائن کے قریب ایک چھوٹی سی گلی اور اس میں ایک چھوٹا سا مکان، مکان کے دروازے پر پرچی لگی رہتی تھی:

''ملاقات سے قبل پیشگی اجازت حاصل فرمائیں''

پرچی پر لکھے ہوئے یہ الفاظ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ کے بعد کارگر نہ رہے کہ مکان کا مکیں پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کے قبرستان میں جا سویا جہاں اب اس کے کسی بھی ملاقاتی کو ملاقات سے قبل پیشگی اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔ چھ کے ہندسے سے شروع ہونے والے ٹیلی فون نمبر 6610648 پر آج چھ برس بعد فون کیجیے تو ایک خاص انداز میں 'فرمائیے' کہہ کر مخاطب ہونے والے کی اہلیہ بھی وہاں نہیں ملیں گی۔ مکان کے مکین بدل چکے ہیں۔

کس کو خبر اس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی کتنے جنازے گئے ہیں آج

معروف نقاد مظفر علی سید نے مشفق خواجہ کی تحریروں کے بارے میں لکھا تھا: ''ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گیدڑ چھپا ہوتا ہے تو خامہ بگوش کی نظریں نہایت تیزی سے اس گیدڑ کو برآمد کر لیتیں''

بقول مختار زمن ''خواجہ صاحب کے اندر بیٹھا ہوا کھلنڈرا بچہ صحیح بات کو اکثر اپنے انداز میں ایسے بیان کر دیتا کہ لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی''۔ ایک اور موقع پر مظفر علی سید کہتے ہیں: '' ان کی کاٹ اکثر دودھاری ہوتی ہے۔ پہلوداری کا کمال ہی یہی ہے کہ ادھر سے اُدھر کا پہلو نظر نہ آئے لیکن جب دونوں طرف ہاہا کار مچتی ہے تو تب پتہ چلتا ہے کہ کون کون زد میں آ گیا''

محمد نگر لاہور میں ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ کو پیدا ہونے والے عبدالحئی، ۲۱ فروری ۲۰۰۵ کے روز کراچی کے ایک اسپتال میں انتقال کر گئے، دنیائے اردو ادب انہیں مشفق خواجہ کے نام سے جانتی تھی، ادبی حلقوں میں وہ خامہ بگوش کے نام سے مشہور تھے۔ بقول انور سدید ''مشفق خواجہ کے انتقال پر وہ لوگ زیادہ رو رہے تھے جن پر خامہ بگوش نے زیادہ سخت کالم لکھے تھے اور جنہیں بار بار اپنے کالم کا موضوع بنایا تھا۔ انہیں غم یہ ہے کہ ان کے بعد اتنے شگفتہ انداز میں ان کا تذکرہ اپنے کالموں میں کون کرے گا۔'' مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرحمان طارق کے مطابق انہوں نے اپنے بھائی کی موت پر غیروں کو بھی پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔ مشفق خواجہ کے انتقال کے بعد شہر کراچی سے علم کا سایہ اٹھ گیا۔ بقول شخصے، شہر کا حافظہ چھن گیا۔ وہ اپنے محدود مالی وسائل کے باوجود نہ صرف بہت سے معذور اور بیمار ادیبوں و شاعروں کی مالی مدد کرتے تھے بلکہ مرحومین کی بیواؤں اور بچوں کی مالی اعانت بھی کیا کرتے تھے۔ ایک ادارے نے ان کا وظیفہ دس ہزار روپے مقرر کیا تھا جو ہر چھ ماہ بعد یکمشت ادا کیا جاتا تھا۔ خواجہ طارق بیان کرتے ہیں کہ یہ رقم ملتے ہی ان کے بھائی پہلے ہی سے مرتب شدہ فہرست کے مطابق اپنے مستحق احباب میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ خواجہ عبدالرحمان طارق کے مطابق مشفق خواجہ کے پاس ڈھائی سو کے قریب ایسے مقالات تھے جن کو وہ خود شائع کرنا چاہتے تھے۔

خواجہ طارق نے اپنے ایک مضمون جہاں اپنے چہیتے بھائی کے بارے میں کئی دلچسپ باتیں بیان کی ہیں وہاں مشفق خواجہ کی کالم نویسی کے 'نتائج' کے ایک پریشان کن پہلو سے بھی قارئین کو آگاہ کیا ہے، لیکن پہلے مشفق خواجہ کا اپنی کالم نویسی سے متعلق یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

''جس قسم کے خطوط (گم نام اور دھمکی آمیز) ہمارے نام آتے ہیں، اگر کسی دوسرے کے نام آئیں تو کالم نویسی ہی کیا، شہر بھی چھوڑ دے اور کسی جنگل میں جا کر بقیہ زندگی یادِ الٰہی میں گزار دے۔''

خواجہ عبدالرحمان طارق اسی سلسلے میں انکشاف کرتے ہیں:
مشفق خواجہ کو اسی کالم نویسی کے سلسلے میں گمنام اور دھمکی آمیز خطوط بھی آئے۔ حضرت راغب مراد تو حد سے گزر گئے۔ مشفق خواجہ کے متعلق فحش رباعیاں لکھ کر تقسیم کر دیں، بقول مشفق خواجہ ''راغب مراد آبادی خبیث نہیں اخبث ہے۔ میں نے ایک دو کالموں (۱۶ اپریل ۱۹۸۹ کو شائع ہوا۔ راقم) میں اس کی شاعری کے بارے میں صحیح رائے تھی، اس وقت سے وہ آتش زیر پا ہے۔ اس نے میرے خلاف بہت سی فحش رباعیاں بھی لکھ کر تقسیم کی ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مجھ سے تحریری طور پر معذرت بھی کی ہے کہ یہ رباعیاں اس نے نہیں لکھیں لیکن میں اس ملعون کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اس کی کسی بات کا جواب لکھوں۔ اس کے بارے میں میرا ایک جملہ ضرب الامثل کی طرح مشہور ہے۔ راغب مراد آبادی کے کلام میں کوئی عروضی غلطی اور کوئی غیر عروضی خوبی نہیں پائی جاتی۔''

اسی طرح ایک مرتبہ عطاء الحق قاسمی کے بڑے بھائی، مدیر ظرافت، ضیاء الحق قاسمی مرحوم، خواجہ صاحب کے پاس اپنا مجموعہ کلام بغرض تبصرہ (فلیپ پر) لائے، بقول مشفق خواجہ ''میں نے کلام دیکھا تو اسے ہر قسم کی رائے سے بے نیاز پایا''۔ قاسمی صاحب کے شدید اصرار پر خواجہ صاحب نے لکھا کہ اس مزاحیہ کلام کو پڑھ کر ہمیں کلام پر نہیں، شاعر پر ہنسی آئی کہ انہوں نے ایک ایسے کام پر محنت کی ہے جو ان کی بساط سے باہر ہے۔ ضیاء الحق قاسمی باقاعدہ طور پر مشفق خواجہ سے ناراض ہو گئے۔

محقق، شاعر اور نقاد مشفق خواجہ کراچی کے اخبار جسارت اور ہفت روزہ تکبیر میں خامہ بگوش کے قلمی نام سے کالم لکھا کرتے تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۹۷ کو اپنا آخری کالم لکھنے کے بعد انہوں نے مکمل طور پر اس شغل سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ مشفق خواجہ کے والد، ۱۹۴۸ میں لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب نے کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۵۷ میں بی اے (آنرز) اور ۱۹۵۹ میں ایم اے (اردو) کیا، ۱۹۵۷ میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہوئے اور ۱۹۷۳ تک اس ادارے میں خدمات سرانجام دیں۔ انجمن میں انہیں مولوی عبدالحق کے ساتھ کئی برس کام کرنے کا موقع ملا۔ اردو مخطوطات پر کام کیا۔ یاس یگانہ چنگیزی کی کلیات مرتب کی۔ انجمن ترقی اردو کے جرائد ماہنامہ اردو اور ماہنامہ قومی زبان کی ادارت کی۔ جریدہ قاموس الکتب کے مدیر بھی رہے۔ برصغیر کے اہم کتب خانوں میں مشفق خواجہ کا کتب خانہ اہم ترین شمار کیا جاتا ہے۔ اس کتب خانے سے ہندو پاک کے کم و بیش پچاس افراد بشمول مشاہیر ادب نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے سلسلے میں استفادہ حاصل کیا۔ مذکورہ کتب خانے میں لگ بھگ بائیس ہزار کتب اور بارہ ہزار سے زائد رسائل و جرائد موجود ہیں۔ خواجہ عبدالرحمان طارق کے مطابق مشفق خواجہ ہزاروں روپے کی کتابیں خرید کر ہندوستانی لائبریریوں بھجواتے تھے، ان میں خدا بخش لائبریری پٹنہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، جامعہ ملیہ لائبریری دہلی، مولانا آزاد نیشنل لائبریری حیدر آباد دکن شامل ہیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ اہم ہے کہ مذکورہ کتب خانے میں مشفق خواجہ کے خطوط، ان کی غیر مطبوعہ تحریریں، ذاتی ڈائریاں، تصویریں اور مخطوطات اب موجود نہیں ہیں۔ یہ خزانہ اب ان کے اہل خانہ کے پاس ہے لیکن اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی۔

محمد مختار عالم حق صاحب نے مشفق خواجہ کی تالیفات و تصنیفات کی تفصیل کچھ اس طرح بیان کی ہے:

۱۔ خوش معرکہ زیبا (تذکرہ شعراء)۔ مجلس ترقی ادب لاہور سے دو جلدوں میں ۱۹۷۰ اور ۱۹۷۱ میں شائع ہوئی

۲۔ پرانے شاعر، نیا کلام۔ سہ ماہی غالب کراچی میں ۱۹۷۵ سے ۱۹۷۶ تک قسط وار شائع ہوا

۳۔ ابیات۔ مجموعہ کلام۔ ۱۹۷۸، کراچی سے شائع ہوا

۴۔ اقبال (احمد دین۔ مشفق خواجہ نے از سر نو مرتب کی)۔ ۱۹۷۹ میں انجمن ترقی اردو، کراچی سے شائع ہوئی

۵۔ غالب اور صفیر بلگرامی۔ ۱۹۸۱ میں کراچی سے شائع ہوئی

۶۔ تحقیقی ادب۔ پانچ جلدوں میں ۱۹۸۰ تا ۱۹۸۵، کراچی سے شائع ہوئی

۶۔ جائزہ مخطوطات اردو۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور سے ۱۹۷۹ میں شائع ہوئی

۷۔ تحقیق نامہ۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور سے ۱۹۹۱ میں شائع ہوئی

۸۔ تقریباً دو درجن تحقیقی مقالات لکھے جو برصغیر کے مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوئے

۹۔ ریڈیو پاکستان کے لیے ۱۹۶۵ تا ۱۹۷۶، مختلف موضوعات پر پانچ سو فیچرز لکھے

۱۰۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۷ء تک مختلف اخبارات ورسائل (صداقت، جسارت، تکبیر، زندگی) کے لیے دو ہزار سے زائد سیاسی وادبی کالمز لکھے۔

۱۱۔ کلیات یگانہ (یاس یگانہ چنگیزی)۔ ۲۰۰۳ء

شاعر مشفق خواجہ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

بجھے ہوئے در و دیوار دیکھنے والو
اسے بھی دیکھو جو اک عمر یاں گزار گئی

پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم، اس پر ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کرلیا

راہ کے مصائب سے تھک کے بیٹھنے والے
زندگی سفر میں تھی، زندگی سفر میں ہے

شاید کم ہی لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ مشفق خواجہ نے اپنی زندگی میں اپنے نادر روزگار کتب خانے کو محفوظ کرنے کی خاطر اردو ریسرچ لائبریری کنسورشیم (یونیورسٹی آف شکاگو کنسورشیم میں شامل) سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کی رو سے مذکورہ کتب خانے کو لائبریری کنسورشیم کو فروخت کردیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد، ان کے عزیز ناصر جاوید کتب خانے کے معاملات کے نگران ہیں اور زیر نظر اہم معلومات انہی کی فراہم کردہ ہیں۔ معاہدے کے تحت اردو ریسرچ لائبریری کنسورشیم، کتب خانے کی فہرست سازی، مائیکروفلمنگ اور پاکستان و دیگر ممالک کے محققین کو اس کتب خانے تک رسائی کو ممکن بنایا جائے گا۔ کتب خانے کی خریداری سے متعلق یہ تمام معاملات مشفق خواجہ کی زندگی ہی میں طے پاگئے تھے۔۔۔ ۱۳ اپریل ۲۰۰۶ء کو مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی خواجہ عبدالرحمان طارق اور ساؤتھ ایشیاء لینگویجز اینڈ ایریا سینٹر کے جیمز نائے کے درمیان کتب خانے کے معاہدہ فروخت پر دستخط ہوئے اور ناصر جاوید کو تمام انتظامی و مالی معاملات کا نگران مقرر کیا۔ ۲۰۰۶ء میں یہ کتاب خانہ ناظم آباد کے ایک گھر میں منتقل کردیا گیا جسے ناصر جاوید پہلے ہی کرایے پر حاصل کر چکے تھے۔ تادم تحریر (نومبر ۲۰۱۱ء) یہ کتب خانہ کرائے کے اسی مکان میں محفوظ ہے۔ کتب خانے کی فہرست سازی اور دیگر معاملات کو چلانے کے لیے چار افراد پر مشتمل عملہ رکھا گیا، کتابوں کو محفوظ کرنے کے لیے نئی الماریاں، فرنیچر، کمپیوٹر اور دیگر ضروری آلات خریدے گئے۔

کتابوں کی کیٹالاگنگ کا کام اس وقت بھی مستقل جاری ہے، مارچ ۲۰۱۱ء تک کل اٹھارہ ہزار کتابوں کے شارٹ ٹائٹل کارڈ بنائے جا چکے تھے۔ ان کارڈز کی تفصیلات کو 'آن لائن کمپیوٹر لائبریری' (OCLC) اور ساؤتھ ایشیاء یونین کیٹلاگ SAUC کے ڈیٹا بیس سے پرکھا گیا۔ ڈیڑھ سال بعد فہرست سازی کے بین الاقوامی سافٹ ویئر کو استعمال کرتے ہوئے مارچ ۲۰۱۱ء تک تیرہ ہزار سے زائد کتابوں کی فہرست سازی کا کام مکمل کرلیا گیا تھا۔

کتب خانے کا نیا نام 'مشفق خواجہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر' قرار پایا ہے۔ یہ کتب خانہ ۲۰۰۸ء میں وقف کے طور پر رجسٹر کرادیا گیا ہے۔ علم وادب سے شغف رکھنے والوں احباب کے لیے یہ ایک خوش کن خبر ہوگی کہ اس کتب خانے کو آن لائن کیے جانے پر تیزی سے کام ہورہا ہے جس کے بعد دنیا میں کسی بھی جگہ سے اس سے استفادہ حاصل کیا جاسکے گا۔

راقم الحروف کی رسائی اس کتب خانے تک گزشتہ ایک برس سے ہے۔ پہلی مرتبہ نامور محقق جناب عقیل عباس جعفری کے توسط سے یہاں قدم رکھنا ابھی تک یاد ہے۔۔۔ جیسے بیمار کو 'بوجوہ' قرار آجائے۔۔

یہاں ایک دلچسپ بات کا ذکر کرتا چلوں، مشفق خواجہ کی ابن انشاء سے بہت دوستی تھی۔ انشاء جی کی قبر پر کتبہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے کئی لوگ ان کی قبر کی تلاش کے بعد مایوس لوٹ جاتے ہیں، عجیب اتفاق ہے کہ ابن انشاء کی قبر کے بالکل سامنے ہی مشفق خواجہ کا کتب خانہ منتقل ہوا ہے۔

مشفق صاحب کے انتقال کے بعد بدخواہوں نے اس قسم کی باتیں مشہور کرنا شروع کردی تھیں کہ اب اس کتب خانے کا کوئی پرسان حال نہیں ہے نیز یہ کہ کتابیں یہاں سے باہر لے جائی جاتی ہیں وغیرہ۔

چند ہندوستانی خودنوشتوں کی نقول بنوانے کے لیے راقم الحروف، ناصر جاوید کو اس بات پر قائل کرتا رہا تھا کہ وہ مطلوبہ کتب کو اپنی مرضی کی جگہ سے نقل بنوانے کی اجازت دے دیں لیکن انہوں نے ابتدا ہی میں یہ بات واضح کردی کہ کوئی بھی کتاب کتب خانے کی عمارت سے باہر نہیں لے جائی جاسکتی۔ مطلوبہ کتب کی نقول کی فراہمی میں ناصر جاوید کا تعاون مثالی تھا، انہوں نے راقم کو کئی ایسی نادر و نایاب خودنوشت کی نقول فراہم کیں جن کا ملنا کسی بھی دیگر ذریعے سے ناممکن تھا۔ اس معاملے میں وہ مشفق خواجہ کے ضرورت مندوں کو ادبی مواد کی فراخدل فراہمی (نقول) کے بے مثال تعاون کے امین نظر آئے۔

مشفق خواجہ کے منتخب کالمز کے مجموعوں و دیگر کتب کی تفصیل کچھ اس

طرح سے ہے:

۔خامہ بگوش کے قلم سے۔ مرتبہ: مظفر علی سید۔ پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور۔ ستمبر ۱۹۹۵ (اسی سال مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے شائع ہوئی)

۔سخن در سخن۔ مرتبہ: مظفر علی سید۔ اکادمی بازیافت، کراچی۔ اپریل ۲۰۰۴

۔سخن ہائے ناگفتنی۔ مرتبہ: مظفر علی سید۔ اکادمی بازیافت، کراچی۔ اپریل ۲۰۰۴

۔سخن ہائے گسترانہ۔ مرتب: انور سدید۔ فضلی سنز کراچی۔ ۲۰۰۶

۔سن تو سہی۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ مرتبین: خواجہ عبدالرحمان طارق/انور سدید۔ مارچ ۲۰۰۸

۔ خامہ بگوشیاں۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ مرتبین: خواجہ عبدالرحمان طارق/انور سدید۔ مارچ ۲۰۱۰

کالموں کے ان مجموعوں کے علاوہ مشفق خواجہ کے خطوط کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

۔مشفق نامے۔ مرتب: محمد مختار عالم حق

۔خطوط مشفق خواجہ۔ مرتب: ڈاکٹر طیب منیر۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۷

۔مکتوبات مشفق خواجہ۔ مرتب: ڈاکٹر سید حسن عباس

۔متعلقات مشفق خواجہ۔ مرتبین: ساحر شیوی، صابر ارشاد، سید معراج جامی۔ قریشی آرٹ، کراچی۔ ۲۰۰۸

۔مکاتیب مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ ناشر: حکیم عروہ سلیمانی۔ فروری ۲۰۰۸

۔مکتوبات مشفق خواجہ بنام نظیر صدیقی۔ ادبیات، لاہور۔ اگست ۲۰۱۰

۔مراسلت۔ صدیق جاوید۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور۔ ۲۰۱۱

مشفق خواجہ پر لکھی گئی چند کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

۔مشفق خواجہ۔ ایک مطالعہ۔ خلیق انجم۔ جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۹۸۵

۔ خامہ بگوش۔ ایک مطالعہ (مقالہ۔ ایم فل)۔ وحید الرحمٰن خان۔ اکادمی بازیافت، کراچی۔ جولائی ۲۰۰۴

۔جوش اور خامہ بگوش۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق (برادر، مشفق خواجہ) ۔فضلی سنز، کراچی۔ سن اشاعت کتاب میں درج نہیں ہے

۔مشفق من خواجہ من۔ محمد مختار عالم۔ مشفق خواجہ پر لکھے گئے متفرق مضامین پر مبنی کتاب۔ بک مین، لاہور۔ ۲۰۰۵

۔ مشفق خواجہ۔ ایک کتاب۔ انور سدید۔ پورب اکادمی، اسلام آباد۔ ۲۰۰۸

۔مشفق خواجہ۔ فن اور شخصیت۔ محمد اسلام نشتر۔ مقتدرہ قومی زبان۔ سن اشاعت: نامعلوم

اس کے علاوہ ادبی جرائد روشنائی، سفیر اردو، سخنور، عبارت اور کتاب نے ان پر ادبی گوشے شائع کیے جبکہ ماہنامہ قومی زبان نے ۲۰۰۶ میں مشفق خواجہ نمبر شائع کیا۔ ہندوستان میں بھی مختلف ادبی جرائد نے ان پر گوشے شائع کیے۔

مشفق خواجہ نجی محفلوں میں بھی اپنے شگفتہ تبصروں کی وجہ سے مرکز نگاہ رہتے تھے۔ راشد شیخ سے روایت ہے کہ ایک محفل میں ایک صاحب کافی دیر سے اپنی تعریف میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے بے اختیار انہیں اپنا ماضی یاد آ گیا اور فرمانے لگے: ''ہمارے بچپن کا زمانہ بھی کیا سستا زمانہ تھا، دایہ بچہ جنوا کر تھوڑا سا گڑ اور آٹھ آنے لے کر خوش ہو جاتی تھی۔''

مشفق خواجہ ان صاحب کی باتیں پچھلے صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ یہ جملہ سنتے ہی انہوں نے بے اختیار کہا: ''اور آٹھ آنے میں بچے بھی آپ جیسے ہی پیدا ہوتے تھے۔''

عطاء الحق قاسمی نے ایک مرتبہ مشفق خواجہ سے پوچھا کہ دوزخ مذکر ہے یا مؤنث؟ خواجہ صاحب نے جواب دیا: میرا خیال ہے مؤنث ہے کیونکہ لوگ اس کے عذاب سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس کے حصول میں لگے رہتے ہیں۔

خواجہ صاحب خود پر بھی فقرہ کسنے سے باز نہ چوکتے۔ مبین مرزا بیان کرتے ہیں کہ ایک بار ہندوستان سے ایک خاتون اور اس کا شوہر ملنے کے لیے آئے۔ دونوں تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور پہلی مرتبہ مشفق خواجہ سے مل رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک تو فضا میں اجنبیت اور تکلف کا تناؤ سا رہا لیکن اس کے بعد خاتون نے ذرا بے تکلفی اختیار کرتے ہوئے کہا خواجہ صاحب ہم تو آپ کے پاس آتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ مشفق خواجہ نے دریافت کیا کیوں؟۔۔ خاتون بولیں ہم نے تو سنا تھا کہ آپ پنجابی ہیں لیکن آپ سے مل کر اطمینان ہوا، آپ کے لب و لہجے، مزاج اور لباس سے کسی طرح ایسا نہیں لگتا۔ خواجہ صاحب نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے جواب

دیا: 'ابھی بس تھوڑی دیر دیکھیے، میری حرکتوں سے معلوم ہو جائے گا۔''

مشفق خواجہ اپنے احباب سے پابندی کے ساتھ خط و کتابت کیا کرتے تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے خطوط پر مبنی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن کی تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے۔ ان خطوط میں بھی خواجہ صاحب نے اپنے منفرد اسلوب کو برقرار رکھا ہے۔ مشفق خواجہ کی مولفہ کتاب کلیات یگانہ پر جعفر بلوچ نے نظم لکھی تو خواجہ صاحب اپنے خط میں ان الفاظ میں جعفر بلوچ کا شکریہ ادا کیا:

''کلیات یگانہ پر آپ کی نظم دیکھی۔ ایسی قادر الکلامی تو یگانہ میں بھی نہیں تھی جیسی اس تبصرے میں نظر آتی ہے۔ بحر بھی ایسی استعمال کی ہے کہ غالب کے بعد آپ ہی نے اس میں شعر کہنے کی جسارت کی ہے۔ خدا جانے کہاں کہاں سے الفاظ اور تراکیب آپ ڈھونڈ کر لائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ظفر علی خان کے بعد آپ قادر الکلامی کے میدان کے مرد ہیں، اگرچہ ذیابطیس کے مرض کے بعد مردانگی محض اتہام کی صورت میں برقرار رہ جاتی ہے۔'' (۱۶ جون ۲۰۰۳)

مشفق خواجہ نے اپنے کالمز میں جن مشاہیر ادب کو نہایت تواتر کے ساتھ مشق ستم بنایا ان میں سرفہرست جوش ملیح آبادی، نظیر صدیقی، مظہر امام، انور سدید، منظر علی خاں منظر، قمر جمیل، انیس ناگی، باقر مہدی، بشیر بدر، استاد اختر انصاری اکبر آبادی، سلطان جمیل نسیم، ساقی فاروقی اور شمس الرحمان فاروقی شامل ہیں۔ باقر مہدی اور مظہر امام تو باقاعدہ طور پر مشفق خواجہ سے ناراض ہو گئے تھے، اتنے کہ خواجہ صاحب کو ان سے معذرت کرنی پڑی۔ واضح رہے کہ مشفق خواجہ کے کالمز طنز و مزاح سے بھرپور ہوتے تھے، کوئی ایک کالم بھی ایسا نہیں جس میں کوئی کٹیلا پن نہ چھپا ہو لیکن ۶ ستمبر ۱۹۸۶ کو لکھا گیا ایک کالم اور شاید واحد کالم ایسا تھا جس میں دنیا سے گزر جانے والے ایک شخص کی دل کی گہرائیوں سے توصیف کی گئی تھی۔ مذکورہ کالم استاد اختر انصاری اکبر آبادی کی ناگہانی وفات پر لکھا گیا تھا جس کا عنوان تھا 'ایک تعزیت نامہ برائے استاذ'۔

مشفق خواجہ کے قلم سے نکلے چند یک سطری تبصرے ملاحظہ ہوں جنہیں ان کے شگفتہ کالمز سے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ وہ کالمز ہیں جو سن ۱۹۸۴ سے سن ۱۹۹۷ تک کراچی کے اخبار جسارت اور ہفت روزہ تکبیر میں شائع ہوتے رہے اور جن کا شہرہ اس قدر رہا کہ ان کا پہلا انتخاب مکتبہ جامعہ نئی دہلی سے 'خامہ بگوش کے قلم سے' کے عنوان سے شائع ہوا اور بعد ازاں اسی عنوان سے یہ کتاب کراچی سے شائع ہوئی۔ آنے والے وقت میں ان کالمز کے مزید مجموعے وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہے اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

۔مہذب ملکوں میں جن کاموں پر سزا دی جاتی ہے، ہمارے ہاں انہی کاموں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔

۔کتاب کو ایک نشست میں پڑھ ڈالا، یہ سوچ کر کہ جو گزرنی ہے وہ ایک ہی مرتبہ گزر جائے۔

۔ہم نے آج تک کسی محقق کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب نہیں دیکھی۔

۔منظر علی منظر کی شاعری زور قلم نہیں، سہو قلم کا نتیجہ ہے۔

۔بشیر بدر کی آدھی زندگی مشاعرے پڑھنے اور آدھی کچھ نہ پڑھنے میں گزری ہے۔

۔جب ابن انشاء کو اپنی کوئی طبع زاد نظم پسند نہیں آتی تھی تو اس پہ یہ لکھ دیتے تھے کہ چینی سے ترجمہ کی گئی ہے۔

۔سعادت سعید اپنے خرچ پر مشاعرے میں آئے اور اپنی ذمہ داری پر کلام سنا کر چلے گئے۔

۔ناول جنم کنڈلی کا دیباچہ انجم اعظمی نے لکھا ہے اور اسے ایک عظیم تصنیف قرار دیا ہے۔ مصنف اور دیباچہ نگار جب دونوں 'اعظمی' ہوں تو تصنیف کے عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔

۔ایک زود نویس ادیب سے کسی نے پوچھا 'آپ اتنا لکھتے ہیں، کبھی تھکتے نہیں؟۔ انہوں نے فرمایا: 'یہ کام میرے پڑھنے والے کرتے ہیں۔''

۔سادات امروہہ کے مشاعرے میں کراچی سے جمیل الدین عالی نے مشاعرہ لوٹا اور باقی شعرا سامعین کے ہاتھوں لٹ گئے۔

۔منظر علی خاں منظر مشاعروں میں شاعر کی حیثیت سے کامیاب ہوں نہ ہوں، سامع کی حیثیت سے کامیاب رہتے ہیں۔

۔مشاعروں میں ہر شخص سخن فہم نہیں ہوتا، کچھ غلط فہم بھی ہوتے ہیں۔

۔روس والے جب ادب پیدا نہ کر سکے تو انہوں نے پڑھنے والے پیدا کر لیے، ہمارے ترقی پسند تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں کہ ادب پیدا کر سکے نہ پڑھنے والے۔

۔انور سدید کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے غالب کے نام سے

ذہنی خطوط لکھ کر قاضی عبدالودود سے بھی داد حاصل کی اور شاید یہی قاضی صاحب کے انتقال کا سبب بھی تھا۔

۔منظر علی خاں منظر کی ہر نئی کتاب کا بوجھ، گناہوں کے بوجھ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، کیونکہ کتاب کو نہ صرف پڑھنا پڑتا ہے بلکہ اس پر کالم بھی لکھنا پڑتا ہے۔

۔منظر علی خاں منظر کی کتاب پر کالم لکھنا تو آسان ہے کہ لکھتے لکھتے ہاتھ جم گیا ہے، لیکن کتاب کو پڑھنا بہت مشکل ہے کہ الفاظ پر نظر تو نہیں جمتی، رگوں میں خون جم کر رہ جاتا ہے۔

۔یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیے ان پر اب انعامات ملتے ہیں۔

۔ایک زمانہ تھا کہ لوگ دور دراز کے مقامات کے سفرنامے لکھتے تھے، لیکن اب یہ حال ہے کہ بعض لوگ اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہیں تو سفرنامہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

۔محقق اکرام چغتائی سے ہم نے عرض کیا کہ آپ نے واجد علی شاہ کی بیویوں پر کچھ زیادہ ہی تحقیق کر ڈالی، اتنی تحقیق تو ان پر خود واجد علی شاہ نے نہیں کی تھی۔

۔علم کا جب کوئی پرسان حال نہ رہا تو سراج منیر نے اسے اپنا لیا، اس سے علم کی بے بسی اور بے کسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۔جب نوٹ دھڑا دھڑ چھپتے ہیں تو افراط زر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور جب کتابیں دھڑا دھڑ چھپتی ہیں تو ادب افراط و تفریط کے مسئلے سے دوچار ہو جاتا ہے۔

۔مشتاق احمد قریشی خوش قسمت ہیں کہ ان کے مجموعہ کلام کو جتنے نقادوں نے سراہا ہے، اتنے نوحہ گر تو غالب کے جنازے میں بھی شریک نہیں تھے۔

۔عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے بہت دلچسپ ہوتے ہیں، عطاء تو سفر سے واپس آجاتے ہیں، لیکن قاری کو واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔

۔مشکور حسین یاد کی کتاب آزادی کے چراغ پڑھنے کے بعد ہم اتنے رقیق القلب ہو گئے ہیں کہ یاد صاحب کی ہر نئی کتاب پڑھ کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

۔راغب شکیب کو دبستان سرگودھا نے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا، اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ دبستان سرگودھا کے ۳۹ ستون سنگ مرمر کے ہیں اور ایک سنگ لرزاں کا ہے۔

۔بعض لوگ ادب تخلیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گھاس کاٹ رہے ہیں اور بعض گھاس کاٹتے ہیں تو وہ ادب بن جاتا ہے۔ انتظار حسین کا شمار اسی دوسری قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔

۔راغب مراد آبادی کا کلام عروضی غلطیوں اور غیر عروضی خوبیوں سے پاک ہوتا ہے۔

۔افتخار عارف کے پیچھے شہرت اس طرح ہاتھ باندھ کر چلتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح پرانے زمانے میں عشاق کے پیچھے رسوائی چلا کرتی تھی۔

۔مظہر امام اتنے منکسر المزاج ہیں کہ اپنی تحریروں سے اپنا علم کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

۔ساقی فاروقی تو اپنے قریب کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ اپنے دائیں بائیں بھی اپنے آپ کو ہی بٹھائے رکھتے ہیں۔

۔جوش کے کلام سے صحت زبان کی سند تو لی جا سکتی ہے، ذہنی صحت مندی کے لیے کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔

۔اقبال اکیڈمی کو کراچی بدر کر کے لاہور کے سپرد کر دیا گیا، حالانکہ اس شہر میں اقبال کا مزار پہلے سے موجود تھا، اقبال اکیڈمی کی وجہ سے ایک ہی شہر میں علامہ کے دو مزار بن گئے۔

۔عروضی غلطی سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آدمی بلا ضرورت شعر کہے۔

۔کشور ناہید اردو شاعری کی پوری عورت ہو یا نہ ہو، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو تنقید کا نصف بہتر ضرور ہیں۔

۔ظفر اقبال کی غزل پڑھیں تو کالم کا مزہ آتا ہے اور کالم پڑھیں تو اس میں غزل کا مزہ آتا ہے۔

۔افتخار عارف کو 'قاموس الاغلاط' ضرور مرتب کرنی چاہیے، یہ کام ان کے لیے نسبتاً آسان ہوگا، اس کے لیے مثالیں تلاش نہیں کرنی پڑیں گی، اپنے کلام ہی سے مل جائیں گی۔

۔ہمارے عام نقاد اچھی شاعری پر برے تنقیدی مضامین لکھتے ہیں لیکن ڈاکٹر انور سدید بری شاعری پر اچھے مضامین لکھنے میں جواب نہیں رکھتے۔

۔جمیل الدین عالی کے نغمے بچے بچے کی زبان پر تھے اور آخری زمانے میں تو صرف بچوں کی زبان پر ہی رہ گئے تھے۔

۔ساقی فاروقی نے فحش شاعری کرنے والوں کی فہرست میں آتش

لکھنوی کا نام بھی شامل کر دیا ہے، یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے شائستہ اور مہذب لکھنے والوں کی فہرست میں خود ساقی کا نام شامل کر دیا جائے۔

۔قمر علی عباسی کے کالم جس اخبار میں چھپتے ہیں اس میں جرائم کی خبروں کے بعد یہی ایک پڑھنے کی چیز ہوتی ہے۔

۔ڈاکٹر سلیم اختر اپنی تاریخ (اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ۔راقم) میں انہی معاصرین کا ذکر کرتے ہیں جن کے کے بارے میں وہ اطمینان کر لیتے ہیں کہ اس کا تعلق دبستان سرگودھا سے تو نہیں ہے

۔آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں کے ذریعے منظر عام پر آتا ہے

۔کشور ناہید صف اول کی شاعرہ، صف دوم کی نثر نگار، صف سوم کی ایڈیٹر اور صف چہارم کی مترجم ہیں، گویا دنیائے ادب کی ساری صفوں پر انہی کا قبضہ ہے۔

۔وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی میں اگر صلح ہو گئی تو انور سدید کیا کریں گے۔ان کے پاس تو مضامین نو کے انبار لگانے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہے گا۔

۔ظفر اقبال واحد شاعر ہے جس کا دریائے سخن سال بھر طغیانی پر رہتا ہے، طغیانی کا نتیجہ تعمیر و تخریب، دونوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

۔وہ شاعر جنہوں نے ظفر اقبال کی پیروی میں لسانی توڑ مروڑ کو اپنا شعار بنایا، ان کا وہی حشر ہوا جو جھوٹے نبیوں پر ایمان لانے والوں کا ہوتا ہے۔

۔علمی و ثقافتی ادارے علامتی نہیں، سچ مچ کے مزار ہیں جن میں علوم و فنون کو دفن کر کے سیاسی سرگرمیوں کے مراکز میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور گورکنوں ہی کو اگلے گریڈ میں ترقی دے کر مجاور بنا دیا گیا ہے۔

۔یہ احمد فراز کی سعادت مندی کی انتہا ہے کہ فیض کے انتقال کے بعد بھی وہ ان سے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔

۔اگر ساقی فاروقی کو ادب کا کوی راج ہرنام داس (ہدایت نامہ خاوند اور ہدایت نامہ بیوی کا مصنف ۔راقم) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۔ساقی فاروقی اپنی تعریف اپنی زبان سے نہیں کرتے بلکہ ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ لوگ خوفزدہ ہو کر ان کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔

۔تحسین فراقی صاحب نے محمد علی صدیقی کے نام اپنے تنقیدی خط میں دو اعتراضات کیے اور خط کے آخر میں 'مخلص تحسین فراقی' لکھا ہے لہذا ہم بھی نہایت خلوص سے عرض کریں گے کہ انہوں نے صدیقی صاحب پر دو نہیں، تین اعتراض کیے ہیں۔

۔جو ادیب ایک سے زیادہ اصناف ادب میں رواں ہوتے ہیں، وہ قارئین کے لیے بہت سے مسائل پیدا کر دیتے ہیں، ہمارے ایک محقق دوست مزاح نگاری کا بھی شوق رکھتے ہیں، ان کی تحقیقی کتاب پڑھتے ہوئے ہنسی آتی ہے اور مزاحیہ مضامین دیکھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

۔ڈاکٹر سلیم اختر زمین پر پاؤں ایسی شائستگی سے رکھتے ہیں کہ کتاب (اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ) کے اگلے ایڈیشن کے لیے راہ خود بخود ہموار ہو جاتی ہے۔

۔کراچی کی کسی ادبی تقریب کا سحر انصاری کے بغیر تصور کرنا ایسا ہی ہے جیسے خود سحر انصاری کا تصور کسی ادبی تقریب کے بغیر کیا جائے۔

۔حق یہ ہے کہ سحر انصاری جیسا کوئی دوسرا مستعد، فعال اور مصروف ادیب ہم نے تو کیا، خود سحر انصاری نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔

۔ڈاکٹر عبادت بریلوی کی جوانی کی تحریریں ایسی ہیں کہ ان میں نہ صرف وہ خود بوڑھے نظر آتے ہیں بلکہ ان کے پڑھنے والے بھی کہولت و کسالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۔ڈاکٹر انور سدید کے پاس سوچنے والا ذہن ہے، ذہن میں سوالات ہیں، سوالات میں گرہیں ہیں اور ہر گرہ کی گرہ میں ادبی مسائل ہیں۔ یہ سب مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں سوائے ایک مسئلے کے جس کا نام ہے ڈاکٹر سلیم اختر۔

۔انیس ناگی بے مثال دیدہ دلیری سے سچ بولتے ہیں، ایسی دیدہ دلیری تو پیشہ ور جھوٹ بولنے والوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

۔عہد میر میں صرف دہلی میں پانچ ہزار شاعر تھے اور آج لاہور کے تھانہ انار کلی کی حدود میں اس سے زیادہ شاعر مل جائیں گے۔

۔جن شاعروں کے سبب غزل نیک نام ہوئی ان کے نام دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ انگوٹھوں کو انگلیوں میں شمار نہ کیا جائے کیوں کہ انگوٹھے، انگوٹھا چھاپ متغزلین کی یاد دلاتے ہیں۔

۔غزل کی صنف پر شاعروں نے جو ستم توڑے ہیں اگر انہیں بیان کیا جائے تو چنگیز اور ہلاکو کے مظالم کوئی حیثیت نہیں رکھتے، چنگیز اور ہلاکو ظلم کرتے

کرتے بھی کبھار تھک بھی جاتے تھے،غزل گو ہر لحظہ تازہ دم رہتے ہیں۔

۔لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح انہیں عزت بھی ملتی ہے اور ذلت بھی۔

۔عام ادبی تحریریں پڑھنے سے پہلے ہم عمداً آنکھیں بند کر لیتے ہیں لیکن کوئی تحقیقی مقالہ دیکھ کر آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔

۔شعر کا ترجمہ شعر میں کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی زندہ جانور کو ہلاک کر کے اس کی کھال میں بھس بھر دیا جائے۔

۔جس طرح سرکاری ملازموں کو ناکارکردگی کی بنا پر جبری ریٹائر کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ادب میں بھی جبری ریٹائرمنٹ کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔

۔ڈاکٹر انور سدید کی کتابوں میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ انہیں کسی قسم کے زیور کی، حتیٰ کہ زیور طبع کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

۔جو شعراء کسی مروجہ صنف سخن میں کمال نہیں دکھا سکتے وہ ہائیکو کے ذریعے صاحب کمال بن جاتے ہیں۔

۔مشہور ہندوستانی ادیب مظہر امام کمال کے آدمی ہیں، ان کی ادبی نیکیاں بے شمار ہیں جنہیں وہ دریا میں نہیں ڈالتے، کتابوں کی صورت میں شائع کر دیتے ہیں۔

☆

ڈاکٹر اسلم انصاری نے مشفق خواجہ کے اسلوب کے بارے میں کیا خوب بات کہی تھی، وہ ادب دوست، لاہور کے جون ۲۰۰۰ کے شمارے میں لکھتے ہیں:

''وہ ادب میں ہر چیز کو برداشت کر سکتے ہیں، لیکن خود نمائی، خود فروشی اور اتھلے پن کو برداشت نہیں کر سکتے۔اسی طرح محض زبان کے نام پر برتری جتانے والے داد و تحسین پانے کی توقع نہیں کر سکتے۔جھوٹے، نقلی اور نان سنس ادیبوں، سرقے کے مرتکب سفرنامہ نگاروں اور اس قبیل کے Petty تنقید نگاروں کو معاف کرنا ان کے مسلک میں جائز نہیں۔وہ یہ سب کچھ ایسے انداز میں کرتے ہیں جو انہی سے مخصوص نظر آتا ہے، محض طنز و مزاح لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے نہیں''

مشفق خواجہ نے اپنی کالم نویسی کے جواز میں یہ کہہ کر بات کو مزید واضح کر دیا تھا کہ: ''جن ادیبوں کے متعلق میں نے کالم لکھے، ان میں بعض بے حد حساس تھے۔ان کا یہی خیال ہے کہ میں نے کسی خاص وجہ سے ان کے خلاف کالم لکھے۔حالانکہ میں نہ کسی کے خلاف لکھتا ہوں اور نہ ہی اس میں کوئی وجہ کارفرما ہوتی ہے۔اگر کسی کتاب میں مجھے کوئی مضحکہ خیز بات نظر آتی ہے تو میں اس کی طرف اشارہ کر دیتا ہوں۔''

کتاب نما دہلی میں مشفق خواجہ کا یہ جملہ ان کی ہر تحریر کے آغاز میں درج ہوتا تھا:

''خامہ بگوش کی نیت پر شک مت کیجیے بلکہ خوبصورت جملوں کا لطف اٹھائیے۔

اردو زبان و ادب کے اس محتسب اعلیٰ، اور بقول شخصے ادیبوں کی آئی ایس آئی، مشفق خواجہ نے ۲۱ فروری ۲۰۰۵ رات ساڑھے دس بجے کراچی کے آغا خان اسپتال میں اس دار فانی کو لبیک کہا۔ان کا جنازہ ۲۲ فروری کو سی ویو کلفٹن کراچی میں واقع ان کی بڑی بہن کے گھر سے اٹھایا گیا۔عصر کے وقت سوسائٹی کے قبرستان میں اپنے والدین کے پہلو میں تدفین ہوئی۔پرستاروں کی ایک بڑی تعداد تدفین کے وقت موجود تھی، وہ علم و دانش کے پیکر کو دفنانے آئے تھے۔لوگوں کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، بعض پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

مبین مرزا بیان کرتے ہیں:

''نماز جنازہ کے لیے وضو کر کے آتے ہوئے میں نے دو آدمیوں کو گفتگو کرتے سنا۔ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا:'یار! اگر اب کچھ پوچھنا پڑا تو کس کے پاس جائیں گے؟'

میں نے رک کر دیکھا، دونوں حضرات کی عمر باون پچپن سے متجاوز ہوگی۔گویا کوئی نوجوان کسی جذباتی دباؤ میں بات نہیں کر رہے تھے، دو پختہ عمر لوگ ایک بے حد سنجیدہ مسئلے سے دوچار تھے۔''

مشفق خواجہ کا قطعہ تاریخ وفات ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے کہا:

تھا بسکہ غنیمت دم مشفق خواجہ
کیسے نہ کریں ماتم مشفق خواجہ
بے سر ہوا، علم اور بے پا تحقیق
ہاتف جو پکارا غم مشفق خواجہ

(بحوالہ: فرائیڈے اسپیشل، کراچی۔ ۱۸ مارچ ۲۰۰۵)

2175-170=2005

☆☆☆

آج کا ادب — آج کی نگاہ

کسوٹی جدید

Kasauti Jadeed, Bihar,
India
18-Jan 2012

مدیران

انور شمیم

محمد افضل خاں

25/-

مشفق خواجہ۔ ایک سچا محقق، کھرا ادیب اور نقاد

کالم۔ اختر شمار

چند معروضات از راشد اشرف

محترم سید خورشید عالم صاحب

محترم احمد صفی صاحب و دیگر احباب

مشفق خواجہ نے یہ خط نظیر صدیقی کو 29 جون 1976 کو تحریر کیا تھا۔ صدیقی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے نام مشفق خواجہ کے لکھے تمام خطوط مشفق خواجہ کے بھائی خواجہ طارق نے حاصل کیے تھے اور یہ مجموعہ 2010 میں شائع کیا۔

مشفق خواجہ کی مکتوب نگاری کے بارے میں چند معروضات پیش کرتا ہوں لیکن اس سے قبل ایک بات یہ واضح کرتا چلوں کہ مشفق خواجہ نے اپنی کالم نگاری میں پاک و ہند کی تقریبا ہر اہم (اور کچھ غیر اہم) ادبی شخصیت کو نشانہ بنایا، خوب لتے لیے۔ کئی غیر اہم شخصیات ان کے دلچسپ کالموں کی وجہ سے اہمیت اختیار کر گئیں۔ اس ضمن میں ایک نام تو منظر علی خاں منظر کا لیا جا سکتا ہے۔ کئی ناخوشگوار واقعات بھی پیش آئے، مثلاً راغب مراد آبادی سے تو ان سے ایسے ناراض ہوئے تھے کہ ان پر فحش ربائیاں لکھ کر لوگوں میں تقسیم کروادی تھیں (یہ قصہ مشفق خواجہ نے ایک مکتوب میں لکھا تھا)۔

ہم سب مشفق خواجہ کے انداز تحریر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ لیکن تین ایسی شخصیات تھیں جن پر انہوں نے (اپنے مخصوص کٹیلے انداز میں) کچھ نہ لکھنے کی قسم کھائی ہوئی تھی اور

اس پر عمل پیرا رہے۔ یہ تین نام ہیں:

جمیل الدین عالی

مشتاق احمد یوسفی

جمیل جالبی

آپ چوتھا نام ابن انشاء کا بھی لے سکتے ہیں لیکن انشاء جی تو خود ایک یکتائے روزگار مزاح نگار تھے اور مشفق خواجہ ان کے چاہنے والے تھے۔ ویسے بھی انشاء جی کی کوئی بات ایسی تھی ہی نہیں جس پر انگلی اٹھائی جا سکے۔ انشاء جی کی وفات پر مشفق خواجہ کا یہ تبصرہ دیکھیے:

> ''ادھر پچھلے چند ہفتوں سے طبیعت بہت ملول ہے۔ انشاء جیسا دوست چھن گیا۔ انشا سے 28 برس کے تعلقات تھے۔ ان اٹھائیس برسوں کا ماتم زندگی بھر کروں گا۔ یقین کیجیے کہ ابھی تک یقین نہیں آتا کہ وہ مر گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ابھی فون کی گھنٹی بجے گی اور وہی مانوس آواز آئے گی کہ 'کیا ہو رہا ہے خواجہ صاحب'؟ ۔۔۔ اگر واقعی یہ فون آیا تو میں کہوں گا، انشا جی۔ خدا کے لیے ایک مرتبہ آ کر دیکھ لو کہ تمہارے لیے لوگ کس قدر رو رہے ہیں۔'' (مکتوب بنام نظیر صدیقی۔ 25 جنوری 1975)

مجھے یاد پڑتا ہے کہ کچھ سال پیشتر کسی صاحب نے مجھے یہ بتایا تھا کہ ایک مرتبہ کسی نے مشفق خواجہ سے یہ سوال کیا تھا کہ آخر آپ نے ان تینوں حضرات پر کبھی کچھ کیوں نہیں لکھا اور خواجہ صاحب اس سوال کو ٹال گئے تھے۔

کہیں ان تینوں حضرات کا تذکرہ آتا بھی تھا تو مشفق خواجہ جھکائی دے کر نکل جایا کرتے تھے۔

اب آیئے مکتوب نگاری کی جانب۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ مشفق خواجہ نے اپنی زندگی میں کہہ دیا تھا کہ ان کے خطوط ان کی وفات کے بعد ہی شائع کرائے جائیں۔ ان کے خطوط کے تمام مجموعوں کا خاکسار نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ یہ کام اس وقت کیا تھا جب میں مشفق خواجہ کے دلچسپ طنزیہ و فکاہیہ اقتباسات کا انتخاب کرر ہا تھا۔ تمام خطوط میں کئی حیران کن باتیں ہیں، انکشافات ہیں۔ ایسی باتیں جن کی ہلکی سی جھلک بھی ہمیں ان کے کالموں میں نظر نہیں آتی تھی۔ ایک خط میں انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ قمر علی عباسی مرحوم کے سفرنامے "دلی دور ہے" میں ناصر زیدی درحقیقت ان کے ہمراہ تھے ہی نہیں (زیدی کا احوال ہمیں "دلی دور ہے" میں قدم قدم پر ملتا ہے)۔ بقول مشفق خواجہ، قمر عباسی نے ناصر زیدی سے متعلق تمام قصے اپنی طرف سے لکھے ہیں۔

ظاہر ہے کہ مشفق خواجہ کا یہ انداز، یہ بے تکلفی محض چند دوستوں ہی تک محدود تھی اور ان میں سرفہرست تھے نظیر صدیقی۔

نظیر صدیقی ایک حد درجے خشک طبیعت کے مالک تھے۔ ایسے غضب کے زود رنج کہ خود مشفق خواجہ سے بھی روٹھ جاتا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ صاحب نے انہیں مرزا ظفر الحسن سے متعارف کرایا لیکن کچھ عرصہ میں وہ ان سے (مرزا صاحب) بھی کسی بات پر ناراض ہو گئے۔ نظیر صدیقی کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا کہ وہ سارے زمانے سے خفا رہتے تھے۔ رسائل کے مدیروں سے انہیں یہ شکایت رہتی تھی کہ ان کے فلاں فلاں مضمون کو نمایاں طور پر جگہ نہیں دی۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ بحیثیت شاعر و ادیب، انہیں وہ مقام ہی نہ دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔ مشفق خواجہ انہیں سمجھایا کرتے تھے، لاڈ کیا کرتے تھے، بچوں کی طرح treat کرتے تھے۔ ایک مکتوب میں نظیر صدیقی کو لکھتے ہیں کہ:

> ''کوئی صاحب ہیں شمیم نوید۔ انہوں نے بھی اپنے مضمون میں آپ پر جملے بازی کی ہے۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ ہم لوگ خود بے توفیق ہیں ورنہ نظیر صدیقی جیسا پیارا، معصوم مگر روشن دماغ شخص اس سلوک کا ہرگز مستحق نہیں ہے جو اس سے کیا جا رہا ہے۔'' (21 اکتوبر، 1971)

لیکن خدا جانے کیا وجہ تھی کہ مشفق خواجہ کو ان سے انتہا درجے کا لگاؤ تھا، بلکہ میں کہوں گا کہ محبت تھی۔ ایک خط میں تو مشفق خواجہ نے نظیر صدیقی کو یہ تک لکھ دیا تھا کہ ''آپ یاد آتے ہیں، اتنے یاد آتے ہیں کہ اگر آپ خدانخواستہ فریق ثانی ہوتے تو مجھے نکاح ثانی کی ضرورت پیش آتی''۔ (نظیر صدیقی کے کراچی سے اسلام آباد منتقل ہونے پر)۔

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ ''نظیر صاحب! آپ ان چند لوگوں میں سے ہیں دنیا داری کا نہیں، دلداری کا تعلق ہے۔''

ایک طرف یہ حال تھا اور دوسری طرف یہ کہ مشفق خواجہ بھی نظیر صدیقی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا کرتے تھے۔ نظیر صدیقی اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل بھی مشفق خواجہ سے کسی بات پر ایک مرتبہ پھر ناراض ہوگئے تھے اور یہ ناراضگی آخری سانس تک قائم رہی تھی۔ ایسی ہی ایک ناراضگی کے دنوں میں 12 اگست 1996 کے روز مشفق خواجہ نے نظیر صدیقی کو ایک خط لکھا۔ شاید اپنی زندگی کے طویل ترین مکاتیب میں سے ایک۔ انہوں نے اپنے دوست کو منایا بھی، اس کی دلداری بھی کی اور ساتھ ہی ساتھ ایسی کھری کھری باتیں بھی لکھ دیں کہ کیا ہی کہنے۔ انہوں نے نظیر صدیقی کو آئینہ دکھایا اور اس انداز میں دکھایا کہ شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتے ہوں گے۔ مذکورہ مکتوب سے چند ٹکڑے پیش خدمت ہیں:

۱

''ابھی کل کی بات ہے آپ نے سو ت اور ارتکاز میں ایک 'رحم' کی اپیل چھپوائی کہ آپ بہت اچھے شاعر ہیں مگر آپ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس رحم کی اپیل کا ہر جگہ مذاق اڑایا گیا۔ ارتکاز کے ایڈیٹر نے آپ کی اپیل کے شروع میں ایک نہایت ضرر رساں نوٹ بھی لکھا۔''

۲

''یہ آپ کی ایک ادائے خاص ہے کہ پہلے آپ ایک مفروضہ قائم کرتے ہیں اور پھر اس کے مطابق نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یہ روش تنقید نگاری کے لیے تو مناسب ہو سکتی ہے۔ لیکن معمولات زندگی کے لیے نہیں۔''

۳

''نظیر صاحب! آپ کو لکھتے ہوئے پچاس برس ہو گئے۔ اب تک آپ کی جتنی بھی تعریف ہوئی ہے، دست طلب دراز کرنے پر ہوئی ہے۔ آج تک کسی شخص نے اپنی مرضی سے آپ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔''

۴

آپ کی سادگی کا یہ عالم ہے کہ آپ ملک راج آنند اور خوشونت سنگھ کے رسیدی خطوں کو اپنی عظمت کی دلیل سمجھ رہے ہیں۔ حضرت! اس قسم کے

رسمی خطوط روایتی اخلاق کے تحت لکھے جاتے ہیں۔ انہیں اسناد کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔"

۵

آپ کی تنگ دلی اور تنگ نظری کی مثالیں پیش کروں تو کاغذ اور روشنائی کا قحط پڑ جائے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ آپ جن لوگوں سے ملنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں وہ آپ سے ملنا پسند نہیں کرتے۔ کراچی میں آپ جس سے ایک مرتبہ ملے، اس نے دوسری مرتبہ ملنا پسند نہیں کیا.............

٦

مجھے معلوم ہے اس خط کے آئینے میں آپ صورت دیکھ کر میری صورت سے بیزار ہو جائیں گے۔ تاہم میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے یہ خط اس محبت کی بنا پر لکھا ہے جو گزشتہ ۲۵ برسوں سے آپ کے لیے میرے دل میں ہے۔"

اب واپس آتا ہوں 29 جون 1976 کو لکھے گئے خط مذکورہ کی جانب۔ یہ ایک طویل مکتوب ہے۔ مکاتیب مشفق خواجہ کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں، ان میں نظیر صدیقی کے نام خطوط کے مجموعہ میں دلچسپی کا عنصر سب سے زیادہ ہے۔ نت نئی باتیں ہیں، قصے

ہیں، اہم حوالے ہیں، پر بہار اور یادگار فقرے ہیں۔ مذکورہ خط میں مشتاق احمد یوسفی سے متعلق جو کچھ کہا ہے، وہ مکمل پیرا ملاحظہ کیجیے:

''مشتاق یوسفی کی نئی کتاب 'زرگزشت' زیر مطالعہ ہے، قریباً 150 صفحے پڑھ چکا ہوں، اب تو یوسفی اس لائق ہو گیا ہے کہ اس پر تحقیق کر ڈالی جائے۔ لکھنوی شاعروں والی رعایتِ لفظی سے 'زرگزشت' اتنی بوجھل ہوگئی ہے کہ ناسخ اور وزیر کے دواوین بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ طنز نگار جب لفظوں کو توڑ مروڑ کر طنز پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو وہ خود بھی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ 'چراغ تلے' کی شہرت نے یوسفی کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس کے فن کا گراف مسلسل نیچے کی طرف سفر کر رہا ہے، جن لوگوں کو راتوں رات شہرت مل جاتی ہے، وہ پھر زندگی بھر اپنی رسوائی کا سامان فراہم کرتے رہتے ہیں''۔

اختر شمار صاحب نے مذکوہ بالا سطور کے فوری بعد اگلا فقرہ یہ لکھا ہے:

''کیا فکر انگیز بات کہی مشفق خواجہ نے''

میں اس تبصرے در تبصرے پر کچھ نہیں کہوں گا۔ زرگزشت میں کئی مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔

میری پسندیدہ کتاب ہے۔ یقیناً آپ سب کی بھی رہی ہوگی۔ مشفق خواجہ کا اپنا نکتہ نظر تھا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بات انہوں نے مکتوب میں لکھی ہے نہ کہ کسی کالم میں۔ وہ نجی خطوط تھے جو ان کے انتقال کے بعد یکے بعد دیگرے شائع ہوتے گئے۔ مشتاق یوسفی صاحب کے بارے میں یہ بھی کسی نے کہا تھا کہ وہ فقروں کو بنا بنا کر لکھتے ہیں۔
چلیے! تو پھر جن صاحب نے یہ اعتراض کیا تھا، وہ ''بنا بنا کر اور جما جما کر'' ایسی دو چار کتابیں لکھ کر دکھا دیں۔ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھنا چاہیے۔ اور یوسفی صاحب کی تحریر کی چاشنی سے کون انکار کر سکتا ہے۔

آپ کی دلچسپی کے لیے میں مذکورہ مکتوب کی وہ سطور بھی پیش کر رہا ہوں جو مشفق خواجہ نے مشتاق یوسفی پر درج بالا رائے کے بعد لکھی تھیں:

> ''یہی حال کرنل محمد خان کی دوسری کتاب 'بسلامت روی' کا بھی ہے، انہوں نے بھی اپنے ہی معیار کو قائم نہیں رکھا۔ بجنگ آمد کی شہرت ہی ان کے لیے کافی تھی۔ بسلامت روی نے ان کی ساکھ میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔''

بسلامت روی کا ذکر ایک اور جگہ بھی آیا ہے اور اس تذکرے میں ایک ایسی کتاب کے

بارے میں مشفق خواجہ کی نجی رائے بھی سامنے آتی ہے جو قارئین میں مناسب طور پر مقبول ہوئی تھی۔ 7 نومبر 1974 کو نظیر صدیقی کے نام لکھے گئے ایک مکتوب میں مشفق خواجہ کہتے ہیں:

> ''ہم یاراں دوزخ میں نے پڑھی ہے۔ لیکن اس میں وہ بات نہیں جو بجنگ آمد میں ہے بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ اس میں بعض جگہ بجنگ آمد کی نقالی کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ جملوں میں خوامخواہ کی ادبیت پیدا کرنے اور شعروں کے بے محل استعمال سے بھی گاڑی پٹڑی سے اترتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسے پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ وقت ضائع گیا۔ اس کے دلچسپ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ بجنگ آمد کے بارے میں میری یہ رائے ہے کہ ایسی کتابیں اردو میں بہت کم ہیں۔ اگر مجھ سے اردو کی دس بہترین کتابوں کا انتخاب کرنے کے لیے کہا جائے تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل ہوگی۔''

کہیے! ''بسلامت روی'' اور ''ہمہ یاراں دوزخ'' سے متعلق مشفق خواجہ کی ان آراء کے بارے میں کیا خیال ہے؟

بہر کیف، درج بالا کتب کے بارے میں مشفق خواجہ کی رائے سے متعلق کہنا وہ چاہتا ہوں

جو سودا اپنے شعر میں کہہ گئے ہیں............ع

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ

کیا جانیے تُو نے اسے کس آن میں دیکھا

لیکن ٹھہریے! مشفق خواجہ اگر راقم کی اس بے ربط سے تحریر کو پڑھتے اور مذکورہ بالا شعر تک پہنچتے تو خیال ہے کہ یہی کہتے کہ:

''شعر کے بے محل استعمال سے بھی گاڑی پٹڑی سے اترتی ہوئی نظر آتی ہے''

واللہ علم بالصواب

خیر اندیش

راشد اشرف۔ کراچی۔ ۲۶ فروری، ۲۰۱۴

☆☆

موقع بھی اور اسے قند مکرر بھی سمجھیے گا کہ اپنے ایک مضمون ''مشفق خواجہ۔اس ایک جنازے کے ساتھ'' میں درج کیے گئے خواجہ صاحب کے چند شگفتہ فقرے پیش کر رہا ہوں۔ پڑھیے اور ہنستے رہیے۔

۔مہذب ملکوں میں جن کاموں پر سزا دی جاتی ہے، ہمارے ہاں انہی کاموں پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی جاتی ہے۔

۔کتاب کو ایک نشست میں پڑھ ڈالا، یہ سوچ کر کہ جو گزرنی ہے وہ ایک ہی مرتبہ گزر جائے۔

۔ہم نے آج تک کسی محقق کے چہرے پر مسکراہٹ اور ہاتھوں میں کوئی معقول کتاب نہیں دیکھی۔

۔منظر علی منظر کی شاعری زورِ قلم نہیں، سہوِ قلم کا نتیجہ ہے۔

۔بشیر بدر کی آدھی زندگی مشاعرے پڑھنے اور آدھی کچھ نہ پڑھنے میں گزری ہے۔

۔جب ابن انشاء کو اپنی کوئی طبع زاد نظم پسند نہیں آتی تھی تو اس پہ یہ لکھ دیتے تھے کہ چینی سے ترجمہ کی گئی ہے۔

۔سعادت سعید اپنے خرچ پر مشاعرے میں آئے اور اپنی ذمہ داری پر کلام سنا کر چلے گئے۔

۔ناول جنم کنڈلی کا دیباچہ انجم اعظمی نے لکھا ہے اور اسے ایک عظیم تصنیف قرار دیا ہے۔ مصنف اور دیباچہ نگار جب دونوں 'اعظمی' ہوں تو تصنیف کے عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔

۔ایک زودنویس ادیب سے کسی نے پوچھا ''آپ اتنا لکھتے ہیں، کبھی تھکتے نہیں؟'' انہوں نے فرمایا: 'یہ کام میرے پڑھنے والے کرتے ہیں۔''

۔سادات امروہہ کے مشاعرے میں کراچی سے جمیل الدین عالی نے مشاعرہ لوٹا اور باقی شعرا سامعین کے ہاتھوں لٹ گئے۔

۔منظر علی خاں منظر مشاعروں میں شاعر کی حیثیت سے کامیاب ہوں نہ ہوں، سامع کی حیثیت سے کامیاب رہتے ہیں۔

۔مشاعروں میں ہر شخص سخن فہم نہیں ہوتا، کچھ غلط فہم بھی ہوتے ہیں۔

۔روس والے جب ادب پیدا نہ کر سکے تو انہوں نے پڑھنے والے پیدا کر لیے، ہمارے ترقی پسند تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں کہ ادب پیدا کر سکے نہ پڑھنے والے۔

۔انور سدید کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے   لب کے نام سے فرضی خطوط لکھ کر قاضی عبدالودود سے بھی داد حاصل کی اور شاید یہی قاضی صاحب کے انتقال کا سبب بھی تھا۔

۔منظر علی خاں منظر کی ہر نئی کتاب کا بوجھ، گناہوں کے بوجھ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، کیونکہ کتاب کو نہ صرف پڑھنا پڑتا ہے بلکہ اس پر کالم بھی لکھنا پڑتا ہے۔

۔منظر علی خاں منظر کی کتاب پر کالم لکھنا تو آسان ہے کہ لکھتے لکھتے ہاتھ جم گیا ہے، لیکن کتاب کو پڑھنا بہت مشکل ہے کہ الفاظ پر نظر تو نہیں جمتی، رگوں میں خون جم کر رہ جاتا ہے۔

۔یہ دن بھی ہمیں دیکھنا تھا کہ جن کتابوں پر جرمانہ ہونا چاہیے ان پر اب انعامات ملتے ہیں۔

۔ایک زمانہ تھا کہ لوگ دور دراز کے مقامات کے سفرنامے لکھتے تھے، لیکن اب یہ حال ہے کہ بعض لوگ اپنے مکان کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے ہیں تو سفرنامہ ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

۔محقق اکرام چغتائی سے ہم نے عرض کیا کہ آپ نے واجد علی شاہ کی بیویوں پر کچھ زیادہ ہی تحقیق کر ڈالی، اتنی تحقیق تو ان پر خود واجد علی شاہ نے نہیں کی تھی۔

۔علم کا جب کوئی پرسان حال نہ رہا تو سراج منیر نے اسے اپنا لیا، اس سے علم کی بے بسی اور بے کسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

۔جب نوٹ دھڑا دھڑ چھپتے ہیں تو افراط زر کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے اور جب کتابیں دھڑا دھڑ چھپتی ہیں تو ادب افراط و تفریط کے مسئلے سے دوچار ہو جاتا ہے۔

۔مشتاق احمد قریشی خوش قسمت ہیں کہ ان کے مجموعہ کلام کو جتنے نقادوں نے سراہا ہے، اتنے نوحہ گر تو غالب کے جنازے میں بھی شریک نہیں تھے۔

۔عطاء الحق قاسمی کے سفرنامے بہت دلچسپ ہوتے ہیں، عطاء تو سفر سے واپس آ جاتے ہیں، لیکن قاری کو واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔

۔مشکور حسین یاد کی کتاب آزادی کے چراغ پڑھنے کے بعد ہم اتنے رقیق القلب ہو گئے ہیں کہ یاد صاحب کی ہر نئی کتاب پڑھ کر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔

۔راغب شکیب کو دبستان سرگودھا نے اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا، اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ دبستان سرگودھا کے ۳۹ ستون سنگ مرمر کے ہیں اور ایک سنگ لرزاں کا ہے۔

۔بعض لوگ ادب تخلیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گھاس کاٹ رہے ہیں اور بعض گھاس کاٹتے ہیں تو وہ ادب بن جاتا ہے۔انتظار حسین کا شمار اسی دوسری قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔

۔راغب مراد آبادی کا کلام عروضی غلطیوں اور غیر عروضی خوبیوں سے پاک ہوتا ہے۔

۔افتخار عارف کے پیچھے شہرت اس طرح ہاتھ باندھ کر چلتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح پرانے زمانے میں عشاق کے پیچھے رسوائی چلا کرتی تھی۔

۔مظہر امام اتنے منکسر المزاج ہیں کہ اپنی تحریروں سے اپنا علم کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

۔ساقی فاروقی تو اپنے قریب کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ اپنے دائیں بائیں بھی اپنے آپ کو ہی

بٹھائے رکھتے ہیں۔

۔جوش کے کلام سے صحت زبان کی سند تو لی جا سکتی ہے، ذہنی صحت مندی کے لیے کوئی رہنمائی نہیں ملتی۔

۔اقبال اکیڈمی کو کراچی بدر کر کے لاہور کے سپرد کر دیا گیا، حالانکہ اس شہر میں اقبال کا مزار پہلے سے موجود تھا، اقبال اکیڈمی کی وجہ سے ایک ہی شہر میں علامہ کے دو مزار بن گئے۔

۔عروضی غلطی سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آدمی بلا ضرورت شعر کہے۔

۔کشور ناہید اردو شاعری کی پوری عورت ہو یا نہ ہو، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اردو تنقید کا نصف بہتر ضرور ہیں۔

۔ظفر اقبال کی غزل پڑھیں تو کالم کا مزہ آتا ہے اور کالم پڑھیں تو اس میں غزل کا مزہ آتا ہے۔

۔افتخار عارف کو قاموس الاغلاط ضرور مرتب کرنی چاہیے، یہ کام ان کے لیے نسبتاً آسان ہوگا، اس کے لیے مثالیں تلاش نہیں کرنی پڑیں گی، اپنے کلام ہی سے مل جائیں گی۔

۔ہمارے عام نقاد اچھی شاعری پر برے تنقیدی مضامین لکھتے ہیں لیکن ڈاکٹر انور سدید بری شاعری پر اچھے مضامین لکھنے میں جواب نہیں رکھتے۔

۔جمیل الدین عالی کے نغمے بچے بچے کی زبان پر تھے اور آخری زمانے میں تو صرف بچوں کی زبان پر ہی رہ گئے تھے۔

۔ساقی فاروقی نے فحش شاعری کرنے والوں کی فہرست میں آتش لکھنوی کا نام بھی شامل کر دیا ہے، یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے شائستہ اور مہذب لکھنے والوں کی فہرست میں خود ساقی کا نام شامل کر دیا جائے۔

۔قمر علی عباسی کے کالم جس اخبار میں چھپتے ہیں اس میں جرائم کی خبروں کے بعد یہی ایک پڑھنے کی چیز ہوتی ہے۔

۔ڈاکٹر سلیم اختر اپنی تاریخ (اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ۔راقم) میں انہی معاصرین کا ذکر کرتے ہیں جن کے بارے میں وہ اطمینان کر لیتے ہیں کہ اس کا تعلق دبستان سرگودھا سے تو نہیں ہے

۔آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں کے ذریعے منظر عام پر آتا ہے

۔کشور ناہید صف اول کی شاعرہ، صف دوم کی نثر نگار، صف سوم کی ایڈیٹر اور صف چہارم کی مترجم ہیں، گویا دنیائے ادب کی ساری صفوں پر انہی کا قبضہ ہے۔

۔وزیر آ اور احمد ندیم قاسمی میں اگر صلح ہو گئی تو انور سدید کیا کریں گے۔ان کے پاس تو مضامین نو کے انبار لگانے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں رہے گا۔

۔ظفر اقبال واحد شاعر ہے جس کا دریائے سخن سال بھر طغیانی پر رہتا ہے، طغیانی کا نتیجہ تعمیر و تخریب، دونوں کی صورت میں ظاہر

ہوتا ہے۔

۔وہ شاعر جنہوں نے ظفر اقبال کی پیروی میں لسانی توڑ امروڑی کو اپنا شعار بنایا، ان کا وہی حشر ہوا جو جھوٹے نبیوں پر ایمان لانے والوں کا ہوتا ہے۔

۔علمی وثقافتی ادارے علامتی نہیں، سچ مچ کے مزار ہیں جن میں علوم وفنون کو دفن کر کے سیاسی سرگرمیوں کے مراکز میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور گورکنوں ہی کو اگلے گریڈ میں ترقی دے کر مجاور بنا دیا گیا ہے۔

۔یہ احمد فراز کی سعادت مندی کی انتہا ہے کہ فیض کے انتقال کے بعد بھی وہ ان سے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔

۔اگر ساقی فاروقی کو ادب کا کوراج ہرنام داس (ہدایت نامہ خاوند اور ہدایت نامہ بیوی کا مصنف۔راقم) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

۔ساقی فاروقی اپنی تعریف اپنی زبان سے نہیں کرتے بلکہ ایسے حالات پیدا کر دیتے ہیں کہ لوگ خوفزدہ ہو کر ان کی تعریف کرنے لگتے ہیں۔

۔تحسین فراقی صاحب نے محمد علی صدیقی کے نام اپنے تنقیدی خط میں دو اعتراضات کیے اور خط کے آخر میں 'مخلص تحسین فراقی' لکھا ہے لہٰذا ہم بھی نہایت خلوص سے عرض کریں گے کہ انہوں نے صدیقی صاحب پر دو نہیں، تین اعتراض کیے ہیں۔

۔جو ادیب ایک سے زیادہ اصناف ادب میں رواں ہوتے ہیں، وہ قارئین کے لیے بہت سے مسائل پیدا کر دیتے ہیں، ہمارے ایک محقق دوست مزاح نگاری کا بھی شوق رکھتے ہیں، ان کی تحقیقی کتاب پڑھتے ہوئے ہنسی آتی ہے اور مزاحیہ مضامین دیکھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

۔ڈاکٹر سلیم اختر زمین پر پاؤں ایسی شائستگی سے رکھتے ہیں کہ کتاب (اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ) کے اگلے ایڈیشن کے لیے راہ خود بخود ہموار ہو جاتی ہے۔

۔کراچی کی کسی ادبی تقریب کا سحر انصاری کے بغیر تصور کرنا ایسا ہی ہے جیسے خود سحر انصاری کا تصور کسی ادبی تقریب کے بغیر کیا جائے۔

۔حق یہ ہے کہ سحر انصاری جیسا کوئی دوسرا مستعد، فعال اور مصروف ادیب ہم نے تو کیا، خود سحر انصاری نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔

۔ڈاکٹر عبادت بریلوی کی جوانی کی تحریریں ایسی ہیں کہ ان میں نہ صرف وہ خود بوڑھے نظر آتے ہیں بلکہ ان کے پڑھنے والے بھی کہولت وکسالت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

۔ڈاکٹر انور سدید کے پاس سوچنے والا ذہن ہے، ذہن میں سوالات ہیں، سوالات میں گرہیں ہیں اور ہر گرہ کی گرہ میں ادبی

مسائل ہیں۔ یہ سب مسائل حل ہوتے چلے جاتے ہیں سوائے ایک مسئلے کے جس کا نام ہے ڈاکٹر سلیم اختر۔

۔انیس ناگی بے مثال دیدہ دلیری سے سچ بولتے ہیں، ایسی دیدہ دلیری تو پیشہ ور جھوٹ بولنے والوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔

۔عہد میر میں صرف دہلی میں پانچ ہزار شاعر تھے اور آج لاہور کے تھانہ انارکلی کی حدود میں اس سے زیادہ شاعر مل جائیں گے۔

۔جن شاعروں کے سبب غزل نیک نام ہوئی ان کے نام دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ انگوٹھوں کو انگلیوں میں شمار نہ کیا جائے کیوں کہ انگوٹھے، انگوٹھا چھاپ متغزلین کی یاد دلاتے ہیں۔

۔غزل کی صنف پر شاعروں نے جو ستم توڑے ہیں اگر انہیں بیان کیا جائے تو چنگیز اور ہلاکو کے مظالم کوئی حیثیت نہیں رکھتے، چنگیز اور ہلاکو ظلم کرتے کرتے کبھی کبھار تھک بھی جاتے تھے، غزل گو ہر لحظہ تازہ دم رہتے ہیں۔

۔لفظ بھی انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں اور مر جاتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح انہیں عزت بھی ملتی ہے اور ذلت بھی۔

ابدی رہائش گاہ

عارضی رہائش گاہ

مجلّہ دراساتِ اُردو

گورمانی مرکزِ زبان وادب

بُنیاد

جلد دوم

شمارہ ۱، ۲۰۱۱ء

لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز

لاہور، پاکستان

مجلہ دراساتِ اُردو "بنیاد"، جلد دوم شمارہ ۱، ۲۰۱۱ء
برائے رابطہ: لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS)
بالمقابل سیکٹر 'یو'، ڈی ایچ اے، لاہور کینٹ۔۵۴۷۹۲
فون نمبر: ۵۸۶۷-۱۱-۱۱۱-۴۲-۹۲+ (توسیع: ۸۰۵۷)
ای میل: bunyaad@lums.edu.pk

ناشر: گورمانی مرکز زبان و ادب، LUMS

سرورق: صدف چغتائی

معین الدین عقیل*

مشفق خواجہ :
تحقیق و تخلیق کے انقلابی موڑ

مشفق خواجہ کی علمی، ادبی اور تہذیبی شخصیت اور حیثیت ان کے انتقال کے بعد سے اب تک موضوعِ گفتگو بنی ہوئی ہے اور یقین ہے کہ یہ سلسلہ ابھی رواں رہے گا۔ ایک عام انسانی حیثیت میں ان کی شخصیت کا محض سماجی پہلو بھی ہر ایک کے لیے پرکشش رہا ہے۔ ان کا لب و لہجہ، طرزِ گفتار، شرینیِ کلام، رکھ رکھاؤ، خوش پوشاکی، یہ سب ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ ٹیلی فون وصول کرتے ہوئے ایک عام روایت کے برعکس ''ہیلو'' کے بجائے ان کا ''فرمایئے'' یا ''جی فرمایئے'' کہنا ایک اجنبی مخاطب کو اسی لمحے زیر کرنے کا باعث بن جاتا۔ گفتگو میں یہ شان بھی رہتی کہ انگریزی کا عام سے عام اور مروج سے مروج لفظ بھی شاذ ہی ان کی زبان سے نکلتا۔ صرف شفاف و شائستہ زبان محفل میں انھیں سب سے مختلف کیے رکھتی۔ لباس کے معاملے میں بھی ان کا رکھ رکھاؤ دیدنی رہتا۔ جہاں مکلّف لباس ضروری ہوتا وہ موقع و محل کی مناسبت سے لباس کو بڑی عمدگی اور سلیقے سے پہنتے اور اس کے لیے خاصا اہتمام بھی کرتے۔ چاہے اس اہتمام میں انھیں تاخیر ہی کیوں نہ ہو جائے اور جھوٹے سچے بہانے ہی کیوں نہ بنانے پڑ جائیں۔ لیکن شام کو محض یوں ہی ٹہلنے نکلتے تو عام سا لباس زیبِ تن کیے رکھتے اور یہ عموماً کرتا پائے جامہ ہوتا۔ شلوار میں کبھی میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ ہمیشہ سفید پائے جامہ پہنتے۔ کرتوں کے لیے رنگ کی قید نہ ہوتی اور عام طور پر ہلکے رنگوں کے اور بالعموم بوسکی کے ہوتے جو بغیر کالر اور کھلے آستین یعنی بغیر کف والے ہوتے۔

---

* ڈاکٹر معین الدین عقیل، سابق صدر، شعبہ زبان و ادب، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

گھر میں تنہا رہتے تو عموماً گرمیوں کے موسم میں صرف بنیان میں رہتے، مگر جب کوئی ملنے والا آ جاتا تو اس کے لیے دروازہ کھولنے سے پہلے کرتا پہن لیتے۔

پینتیس۔چھتیس سالہ رفاقت میں صرف ایک بار ایسا ہوا کہ میں نے انھیں کئی گھنٹے صرف بنیان میں دیکھا اور وہ بھی گھر یا تخلیے میں نہیں، ریل گاڑی کے بھرے ڈبے میں سفر کرتے ہوئے! یہ شدید گرمی کا موسم تھا اور مشفق خواجہ، رقم الحروف اور ہمارے ایک بہت قریبی مشترک دوست سید اظہر الحق حقی (پروفیسر اور پرنسپل، شپ اونرز کالج، کراچی، مگر اس وقت محض ایک نوجوان لیکچرر۔ پیدائش: ۱۹۴۷ء) اپنی بیگمات کے ساتھ، تین دن نواب شاہ میں محمد یعقوب خان خویشگی کے آموں کے باغ میں گزار کر اور اسی باغ میں واقع ان کا ذاتی کتب خانہ بالاستیعاب دیکھ کر بذریعۂ ریل کراچی واپس جارہے تھے۔ ریل کا یہ سفر دن کے ان پہروں کا تھا جب شدید گرم موسم میں دھوپ اور گرمی بلا کی ہوتی ہے۔ پھر سندھ کا ریگستانی علاقہ۔ نواب شاہ سے ائرکنڈیشنڈ ڈبے میں جگہ کا ملنا ناممکن تھا۔ چناں چہ لو کے تھپیڑوں میں خواجہ صاحب کے لیے گرمی کا برداشت کرنا ممکن نہ رہا۔ ان کی حالت غیر ہوگئی۔ چناں چہ وہ اس حد تک بے حال ہوگئے کہ انھوں نے کرتا اتار دیا اور ایک تولیا بھگو کر سر پر اوڑھ لیا اور سارا راستہ اسی عالم میں بار بار تولیا بھگو کر سر پر اوڑھتے اور کھلے دروازے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے مگر چین انھیں پھر بھی نہ آتا تھا۔

ان کی شخصیت کے ایسے پہلوؤں نے انھیں ہمیشہ دوسروں سے ممتاز اور مختلف رکھا۔ یہی حیثیت علم و ادب اور تحقیق کی دنیا میں ان کی رہی۔ مطالعہ، بالخصوص قدیم اور جدید اردو ادب کا بے پناہ اور حافظہ بھی غضب کا تھا۔ اس لیے اپنی معلومات کے لحاظ سے محفل میں سب میں نمایاں رہتے۔ اظہار کے معاملے میں تخلیق اور تحقیق دونوں میں دل چسپی رہی۔ فطری طور پر طبع موزوں بھی رکھتے تھے اور ایک زمانے تک، یعنی نوجوانی سے کوئی پچاس سال کی عمر تک، شعر کہتے رہے اور مزاج کو غزل ہی سے مناسبت رہی۔ اپنے عہدِ جوانی میں اپنی غزل پر انھیں اعتماد بھی رہا کہ جب ان کی غزلیں ان کے دوست اور احباب کے وسیلے سے، جو ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے، گلوکاروں نے ریڈیو کے لیے گائیں تو وہ سرخوشی میں ان کا ذکر ان لوگوں سے بھی کر دیتے جو ریڈیو نہیں سنتے تھے یا موسیقی سے کوئی خاص لگاؤ نہ رکھتے تھے۔ جب ان کی غزلوں کا مجموعہ *ابیاتِ* شائع ہوا۔ تو وہ بڑے شوق سے اس کی اشاعت اور تقسیم کا خود اہتمام کرتے رہے۔

کتابت اور سرورق کی دل کشی و خوبصورتی کے لیے انھوں نے خاصے جتن کیے۔ یہ سارا اہتمام سید اظہر الحق حقی کے برادرِ نسبتی کے پریس واقع لیاقت آباد (کراچی) میں ہو رہا تھا۔ طباعت کے مرحلے میں جب کاپیاں اور سرورق چھپ کر آیا تو وہ خواجہ صاحب کے معیار سے کم تر تھے۔ خواجہ صاحب بہت چراغ پا ہوئے اور سب کو رد کر دیا اور پھر سب کچھ دوسرے پریس میں چھپوایا۔

ان کا یہ عمل اور رویہ ان کی نفاست پسندی، خوش ذوقی اور اپنے شعری مجموعے کو عمدگی سے پیش کرنے کی ایک مثال کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، لیکن چند ہی برسوں میں ان میں یہ نمایاں تبدیلی بھی آئی کہ جب *ابیات* کا وہ ایڈیشن ختم ہو گیا اور ان کی اس جانب توجہ دلائی گئی تو انھوں نے اس کی اگلی اشاعت میں کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ اب یوں لگتا تھا کہ انھوں نے شعر گوئی سے دلچسپی ہی لینی چھوڑ دی تھی اور یہ بھی سننے میں آیا کہ بازار میں *ابیات* کے جو بچے کھچے نسخے موجود تھے، انھوں نے انھیں بھی واپس منگوا لیا تھا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ میرے ذریعے سے *ابیات* کے ایک دو نسخے انھوں نے جاپان (پروفیسر سوزوکی تاکیشی اور پروفیسر اسادا یوتاکا) کو بذریعۂ ڈاک بھجوائے تھے لیکن جب وہاں سے کوئی رسید نہ آئی تو وہ ایک عرصے تک مجھ سے پوچھتے رہے کہ ''وہاں سے کوئی رسید آئی؟، پوچھ لیجیے کہ انھیں کتاب مل گئی''۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ تحریر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ میں عمر اور مرتبے میں ہر لحاظ سے ان سے چھوٹا تھا لیکن ہمارے درمیان رشتہ بے تکلفانہ اور غیر رسمی رہا مگر انھوں نے مجھے ہمیشہ ''آپ'' ہی کہہ کر مخاطب کیا۔ مولانا ابو سلمان شاہ جہاں پوری اور سعید احمد (کارکن انجمن ترقی اردو اور افسانہ نگار مشرف احمد کے برادرِ خورد) بھی ان کے بہت قریب رہے، بلکہ ان کے قرب کا عرصہ میرے مقابلے میں زیادہ طویل تھا، لیکن انھیں بھی، ان کے خاصا کم عمر ہونے کے باوجود، وہ ''آپ'' ہی سے مخاطب کرتے۔ میں نے کسی کو انھیں ''تم'' سے مخاطب کرتے ہوئے نہ سنا۔ ہاں، اگر وہ کسی کو ''تم'' کہتے تھے تو وہ یا تو ان کی ''بیگم'' تھیں یا ان کے گھر کے اور انجمن ترقی اردو کے ملازم تھے یا پھر یہ حیران کن ہے کہ سید یوسف بخاری تھے! یوسف بخاری، دلّی کا روڑا، شاہد احمد دہلوی، ملا واحدی، اشرف صبوحی کے معاصر اور رفیق۔ خواجہ صاحب سے عمر میں شاید بیس پچیس برس زیادہ ہی ہوں گے، یہ عقدہ کبھی نہ کھلا کہ خواجہ صاحب فقط یوسف بخاری کو ہی کیوں ''تم'' سے مخاطب کرتے تھے۔ میں نے انھیں کبھی یوسف بخاری کو ''آپ'' سے مخاطب کرتے

ہوئے نہ سنا! جب کہ وہ ہوٹل کے بیرے کو بھی، عام ٹھیلے والوں کو بھی، ''آپ'' ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ تخلیق کی مناسبت سے، شاعری سے قطع نظر، کہ جسے ایک وقت خود انھوں نے ترک بھی کر دیا اور جو کچھ لکھا، اس سے بھی صرف نظر کرنے لگے، ان کی کالم نگاری یقیناً ان کی ادبی و تخلیقی شخصیت کا ایسا وصف ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ یادگار رہے گا۔ ادبی موضوعات اور شخصیات پر لکھے ہوئے ان کے کالم اردو زبان میں یا ادبی کالم نویسی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ ہمیشہ دل چسپی سے پڑھے جائیں گے۔ سیاسی شخصیات پر لکھے ہوئے ان کے دور اول کے کالم بھی نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ مشفق خواجہ کی اصل شہرت، ان کی شخصیت اور ان کے دیگر ادبی کاموں سے قطع نظر، ان کی کالم نویسی ہی کے باعث عام ہوئی ہے۔ شاعری کو ان کا امتیاز نہیں کہا جاسکتا اور اس کے حوالے سے ان کی شہرت اور ان کا مقام شاید قابل لحاظ کبھی نہ رہے۔ تحقیق یقیناً ان کا ایک امتیاز ہے اور اس حوالے سے ان کی شہرت اور ان کا مقام شاید قابل لحاظ بھی ہے، مگر عوام یا عام افراد کے لیے مشفق خواجہ کچھ تھے' تو وہ ان کے مقربین کے لیے ان کی شخصیت کے دل نشین اوصاف کے باعث تھے یا ان کی کالم نویسی کے باوصف۔

اس میں شاید اب کوئی کلام نہیں کہ واقعی مشفق خواجہ کی مثالی شہرت کا دار و مدار ان کی کالم نویسی تھی اور یہی کالم نویسی انھیں تا دیر زندہ بھی رکھے گی، لیکن کیا واقعی مشفق خواجہ محض ایک کالم نگار کے طور پر ہی یاد کیے جائیں گے؟ *جائزۂ مخطوطات اردو*۲، *تحقیق نامہ* (کے بلند پایہ تحقیقی مقالات) ۳، *غالب اور صفیر بلگرامی* ۴ کے مصنف کو، جس نے *تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا* ۵، *اقبال* (از احمد دین) ۶ اور *کلیات یگانہ* ۷ جیسے متون بھی مرتب و مدون کیے' کیا دنیا جلد بھول جائے گی؟

جائزۂ مخطوطات اردو کے شائع ہونے سے قبل ہی مشفق خواجہ ایک ''محقق'' کی حیثیت میں معروف ہو چکے تھے۔ انجمن ترقی اردو اور اس کے اس وقت کے مؤقر تحقیقی مجلے *اردو* سے وابستگی کے عرصے میں ان کے تحقیقی مقالات نے، جو *اردو* ۸، *صحیفہ* ۹ اور *اقبال ریویو* ۱۰ میں چھپ چکے تھے، انھیں ایک زیرک' وسیع المطالعہ اور سنجیدہ اسلوب کے حامل ایک ایسے محقق کے طور پر متعارف کروا دیا تھا' جس کے مثالی کارنامے: *جائزۂ مخطوطات اردو* کی اشاعت نے ان سے تحقیقی اور علمی دنیا کو ایسی توقعات وابستہ کرنے کی تحریک دی' جیسی کبھی امتیاز علی عرشی

(۱۹۸۱ء۔۱۹۰۴ء)، حافظ محمود شیرانی (۱۹۴۶ء۔۱۸۸۰ء)، اور قاضی عبدالودود (۱۹۸۴ء۔ ۱۸۹۶ء) سے وابستہ کر لی گئی تھیں اور جسے ان بزرگوں نے پورا بھی کر دکھایا تھا۔ چناں چہ یہ سوالات مشفق خواجہ کے چاہنے والوں، ان سے وابستہ رہنے والوں اور تحقیق اور کلاسیکی ادب کے مطالعے سے دل چسپی رکھنے والوں کے ذہنوں اور جائزوں و مطالعوں میں گردش کرتے رہے ہیں اور آج بھی گردش کر رہے ہیں کہ کیا مشفق خواجہ نے *جائزۂ مخطوطاتِ اردو* کی اشاعت کے بعد تحقیق کی دنیا میں ان سے وابستہ توقعات کو پورا کیا ہے؟ ورثے میں ملنے والے ایک وقیع اور نادر و مفید کتب خانے کے مالک نے، کہ جس کتب خانے کے پھیلاؤ میں خود اس کی زندگی بھر کی اپنی دل چسپی اور لگن بھی شامل رہی ہو، اور ایک بے حد وسیع المطالعہ شخص نے' جسے مولوی عبدالحق (۱۹۶۱ء۔۱۸۸۰ء) جیسے محقق کی صحبت بھی میسر آئی تھی اور جس نے مولوی عبدالحق، سخاوت مرزا (۱۹۷۷ء۔۱۸۹۸ء) اور افسر صدیقی (متوفی ۱۹۸۴ء) جیسے محققین کی شفقتوں کے زیر سایہ تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہو، کیا اس کے پیش کردہ کل تحقیقی سرمایے میں فقط اتنا ہی کچھ ہونا چاہیے تھا؟ اور کیا تحقیق میں انھوں نے اتنے ہی بڑے کام کیے جتنے وہ اس حوالے سے مشہور و معتبر ہوئے؟

یہ اور ایسے دیگر متعدد سوالات میں مشفق خواجہ کی شخصیت اور حیثیت کے بارے میں جو اخلاص اور دل بستگی ہے وہ مخفی نہیں، نمایاں ہے۔ میری طرح کے ان کے وابستگان میں، جو خواجہ صاحب سے نسبت و محبت بھی رکھتے ہیں اور ان کے تحقیقی کارناموں کے معترف اور وکیل بھی ہیں' ان سوالات کے جوابات کو مشفق خواجہ کے حق میں کم ہی دیکھ پاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب *جائزۂ مخطوطاتِ اردو* شائع ہوا تو بعض اکابر اور خود راقم الحروف نے، اس وقت اس پر تبصرہ لکھا تھا تو اس کے فاضل محقق کو اردو کا بروکیلمن (C. Brokelmann، ۱۹۵۶ء۔۱۸۶۸ء) [11] اور سی۔اے اسٹوری (C. A. Storey، ۱۹۶۷ء۔۱۸۸۸ء) [12] قرار دیا تھا، جو علی الترتیب عربی اور فارسی مخطوطات و مطبوعات کے بے مثل فہرست ساز گزرے ہیں۔ *جائزۂ اردو مخطوطات* خواجہ صاحب کی اس سلسلے کی پہلی جلد تھی اور سرورق اور پیش لفظ میں بھی اسے پہلی جلد ہی لکھا گیا تھا۔ خود مشفق خواجہ بھی اس کی دوسری بل کہ اگلی جلد کے مواد کے یکجا کر لینے اور اسے ترتیب دینے کا ذکر کرتے رہتے تھے، اور دوسری جلد کے بارے میں ایک وقت یہ بھی کہنے لگے تھے کہ مسودہ ناشر (''مرکزی اردو

بورڈ''، لاہور) کو بھیج دیا گیا ہے۔ لیکن پھر یہ بھی سنا کہ مشفق خواجہ کی کچھ اضافی شرائط کو اس وقت کے ناظم اور مشہور افسانہ نگار اشفاق احمد (۲۰۰۴ء۔۱۹۲۵ء) نے منظور نہ کیا، چناں چہ وہ مسودہ واپس آ گیا۔ پھر برسوں بعد یہ بھی سنا کہ وہ مسودہ *مقتدرہ قومی زبان* کو بھیجا گیا، لیکن اس زمانے میں کئی برسوں کے لیے میں ملک سے باہر چلا گیا تھا، جس کے باعث بعد میں کوئی اطلاع راست مشفق خواجہ سے مجھے نہ مل سکی۔ یہ ساری باتیں محض اس *جائزہ* کی دوسری جلد کی اشاعت کے بارے میں سننے میں آتی رہیں، بقیہ مزید جلدوں کے بارے میں خود مشفق خواجہ نے کبھی کچھ نہ کہا۔ جب کہ کراچی کے قومی عجائب گھر کے اردو مخطوطات، جس پر اس *جائزہ* کی اگلی جلدوں کو مشتمل رہنا تھا، اس جلد اول میں محض آٹھ دس فیصد سمیٹے جا سکے تھے۔

ایسا ہی کچھ *تذکرہ خوش معرکہ زیبا* کے بارے میں بھی کبھی خواجہ صاحب بتایا کرتے تھے اور اس کے پیش لفظ میں بھی تحریر ہے کہ اس کے تعلیقات کی جلد جو اس طرح اس تذکرہ کی تیسری جلد ہوگی، وہ تحریر کر چکے ہیں اور یہ *مجلس ترقی ادب* ہی سے، جہاں سے اس کی دو جلدیں چھپی تھیں، شائع ہوگی۔ لیکن یہ معاملہ بھی اس قدر تاخیر کا شکار ہوا کہ یہ تیسری جلد شائع نہ ہوئی۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ دراصل اس تذکرے کے تعلیقات خواجہ صاحب نے مقالات کی صورت میں، اولا سہ ماہی *غالب* (کراچی) میں ''پرانے شاعر نیا کلام'' کے زیر عنوان شائع کرانے شروع کر دیے تھے، اور چند شائع بھی ہوئے[۱۳] لیکن پھر جتنے مقالات اس صورت میں مکمل ہوئے انھیں *تحقیق نامہ* میں شائع کر دیا گیا۔ اس طرح یہ *جائزہ* اور یہ *تذکرہ* دونوں نامکمل رہے اور خواجہ صاحب کے وعدے اور منصوبے بوجوہ تشنہ رہ گئے۔

تحقیق میں مشفق خواجہ کے یہ دونوں کام اپنی اپنی جگہ مثالی اور ممتاز ہیں لیکن وہ توقعات جو اردو کے بروکیلمن اور سی۔ اے اسٹوری سے ان کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں نے ان سے وابستہ کر لی تھیں، افسوس وہ پوری نہ ہوسکیں۔ مولوی احمد دین کی تصنیف *اقبال* اور کلیات یگانہ کی تدوین ان کی تحقیق میں چوتھے اور پانچویں بڑے کام تھے جو خود ان کے بقول ان کی تیس سالہ جستجو اور محنتوں کا ثمر تھے، لیکن کیا یہ *جائزہ* اور *تذکرہ* کے معیار کے کام تھے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے دو جواب ملتے ہیں۔ دو جوابوں کا ہونا ہی مشفق خواجہ کی اصل حیثیت کے تعین کے لیے، جو اگر تحقیق کے حوالے سے ابھری تھی، کچھ خوش کن اور قابل اطمینان نہیں۔ *جائزہ* اور *تذکرہ* قریب

قریب ایک ہی عرصے میں یکے بعد دیگرے سامنے آئے تھے۔ بعد میں تحقیق کے زمرے میں خواجہ صاحب کے صرف چند مقالات شائع ہوئے' جو قوی گمان ہے کہ دراصل تذکرہ کے تعلیقات ہی تھے لہذا انھیں تذکرہ ہی کا ذیلی کام سمجھا جانا چاہیے۔ *غالب اور صفیر بلگرامی* بھی دراصل کوئی مستقل تصنیف نہیں، یہ بھی مقالات کا مجموعہ ہی ہے، جو ان کی جستجو اور ان کی محنت کے مثالی ثبوت ہیں۔ مگر کیا تحقیق کی دنیا کو اتنا کچھ مل گیا' جو مشفق خواجہ دے سکتے تھے؟ یہ زیادہ بڑا سوال ہے۔ ایسا ہی ایک وعدہ اور منصوبہ بہاالدین بشیر کے تذکرے کی ترتیب و تدوین کا بھی تشنہ اور نامکمل رہ گیا' جس پر وہ ایک معرکتہ الآرا مقالہ لکھ چکے تھے[۱۴] اور پھر وہ بقول خود کئی برس اس کی تدوین میں مصروف رہے۔ ایسا ہی معاملہ *تذکرہ گلشن مشتاق*[۱۵] کے ساتھ بھی رہا۔ آخری برسوں میں ان دونوں تذکروں کا ذکر بھی ان کی زبان پر نہیں آتا تھا۔

میرے زاویے سے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مشفق خواجہ اگر جائزہ کی اگلی جلدیں مکمل کر پاتے تو اردو کو ایک بروکیلمن اور اسٹوری تو دے ہی سکتے تھے۔ یا کم از کم سطح پر تذکرہ اور *صفیر بلگرامی اور غالب* جیسی اور تصانیف تو دے ہی سکتے تھے اور اس طرح عرشی صاحب' شیرانی صاحب اور قاضی صاحب نہ سہی، مسعود حسن رضوی ادیب (۱۹۷۵ء۔۱۸۹۳ء) اور مالک رام (۱۹۹۳ء۔۱۹۱۲ء) کی صف میں تو ضرور ہی شامل ہوسکتے تھے، اور شاید سرفہرست رہتے، لیکن افسوس ایک بڑے ابھرتے ہوئے اور صف اول میں جگہ پاتے ہوئے محقق کو، کئی اسباب ہیں کہ جنھوں نے اپنے راستے سے ہٹا کر دوسرے راستوں پر چلنے پر مجبور یا آمادہ کر دیا اور یوں ایک بڑا امکنہ محقق ہم سے چھن گیا۔

جہاں تک اس کے اسباب یا ان سے متعلق سوال کا تعلق ہے' میں خود کو اس کا جواب دینے کا پابند سمجھتا ہوں اور بڑی ذمے داری اور سنجیدگی سے کہہ سکتا ہوں کہ مشفق خواجہ کو ''تحقیق'' سے اولاً عطاالحق قاسمی (۔۱۹۴۳ء) نے اور پھر ادا جعفری (۔۱۹۲۴ء) نے دور کر دیا! یہ باتیں سب ہی قارئین کے لیے حیران کن بلکہ چونکا دینے کا باعث ہوسکتی ہیں، لیکن میں مشفق خواجہ کو پینتیس۔ چھتیس سالوں تک بہت قریب سے، بلکہ انتہائی قریب سے، اور روزمرہ مشاہدے کی حد تک غور سے دیکھتا رہا ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان تعلقات اور روابط کی نوعیت پر میری دو تحریروں *مشفق خواجہ کے آخری دس دن*[۱۶] میں کسی حد تک دیکھا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ تحریریں

محض اشاروں پر مشتمل ہیں۔ تعلقات کے اس طویل عرصے میں کم ہی ایسی شامیں یا ایسے دن گزرے ہیں جب ہم کراچی میں ہوں اور نہ مل سکے ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ خواجہ صاحب دن بھر گھر میں اپنے کام کرتے رہتے اور وہ زمانہ *جائزۂ مخطوطات اردو* اور *تذکرہ خوش معرکۂ زیبا* کی تکمیل و اشاعت اور *غالب* اور *صفیر بلگرامی*، *اقبال* اور *کلیات یگانہ* کی تدوین و ترتیب کا تھا۔ وہ دن بھر یہ کام کرتے لیکن شام کو دن بھر کی تھکن اتارنے، تازہ دم ہونے اور ہوا خوری کے لیے گھر سے نکل پڑتے اور قریب ہی غالب لائبریری پہنچتے ' جہاں میں اور مرزا ظفر الحسن مرحوم (۱۹۸۴ء۔۱۹۱۶ء) ان کے منتظر ہوتے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ہم وہیں ساتھ رہتے۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتیں' مرزا ظفرالحسن سے خوش گپیاں ہوتیں اور خواجہ صاحب سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہتے۔ مرزا صاحب تو رات ۹ بجے لائبریری بند کروا کر گھر کے لیے روانہ ہو جاتے اور ہم دونوں یا اور جو بھی اس وقت ہمارے ساتھ ہوں، مرزا صاحب کو رکشہ یا ٹیکسی میں بٹھا کر کسی اور طرف نکل جاتے یا بالعموم کسی ریستوران میں جا بیٹھتے اور یوں تقریباً ۱۱ بجے تک ساتھ رہتے۔ ان ہی شاموں میں خواجہ صاحب کبھی کبھی دوستوں کی دعوتوں میں، مخصوص محفلوں اور تقریبات میں بھی شریک ہوتے۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا اور وہ ان دنوں تواتر کے ساتھ اپنے تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں دن بھر مصروف رہتے۔ ہاں ان ہی میں تقریباً دو اڑھائی برس ایسے بھی گزرے جب خواجہ صاحب روز ہی صبح گھر سے نکل کر قومی عجائب گھر (کراچی) جاتے اور وہاں عجائب گھر کے دفتری وقت کے خاتمے تک بیٹھے *جائزہ* کا کام کرتے رہتے۔

اس دوران ہماری گفتگوؤں کا محور عام طور پر کلاسیکی ادب، نئی پرانی کتابوں اور پھر مختلف موضوعات پر کتب حوالہ یا مآخذ کی تلاش و جستجو پر مشتمل رہتا۔ بھارت سے کتابوں کی آمد کا ایک مستقل سلسلہ ان کے ہاں جاری رہتا۔ وہ ہر اہم کتاب یا مصنف کے بارے میں مجھے ضرور اطلاع دیتے اور اسی طرح مجھ سے، کہ میں ہر دوسرے تیسرے دن کتابوں کی دو کانوں پر ضرور جاتا تھا، دریافت کرتے رہتے کہ کون کون سی اہم نئی کتابیں آئی ہیں یا کونسی پرانی یا کمیاب و نادر کتابیں دستیاب ہوئی ہیں؟ لیکن پھر یکایک مشفق خواجہ میں ایک تبدیلی بہت واضح اور نمایاں دیکھنے میں آئی اور اس کا محرک یا سبب میں عطاالحق قاسمی کو سمجھتا ہوں۔

ہوا یوں کہ عطاالحق قاسمی نے بیٹھے بٹھائے اپنا ایک ادبی مجلّہ *معاصر* جاری کر دیا۔ یہ

۱۹۷۹ء کے اواخر کا واقعہ ہے۔ اس کا پہلا ہی شمارہ ضخیم، پرکشش اور متنوع تحریروں پر مشتمل شائع ہوا تو اس کا بڑا چرچا ہوا۔ کچھ تو رسالے ہی کی کشش، کچھ قاسمی صاحب کی عوامی رابطے کی قابل رشک صلاحیتوں اور صحافت اور صحافیوں کے ساتھ ان کی وابستگی' چناں چہ معاصر کے چرچے کراچی کے ادبی حلقوں تک میں ہونے لگے۔ کراچی میں یہ بیک وقت خواجہ صاحب اور راقم الحروف کو موصول ہوا۔ میں اس وقت اخبار جسارت کے ادبی صفحے کو مرتب کیا کرتا تھا۔ اس پر پہلے اس میں ایک خبر شائع ہوئی' پھر ایک تبصرہ بھی چھپا۔ خبریں اور تبصرے دوسرے اخبارات اور رسائل میں بھی شائع ہوئے اور تعارفی تقاریب بھی تقریباً ہر بڑے شہر میں منعقد ہوئیں۔ ان سب کے چرچے کراچی میں پہنچنے لگے' پھر اس پر مستزاد ایک تعارفی تقریب خاصے زور و شور سے کراچی میں بھی منعقد ہوئی۔ قاسمی صاحب نے بہ اصرار مشفق خواجہ صاحب کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا۔ اور اس طرح اصرار کیا کہ خواجہ صاحب راضی ہو گئے۔ خواجہ صاحب کبھی اس طرح کی تقریبات میں شریک نہ ہوتے اور اگر شریک ہوتے تو تنہا نہ جاتے، کسی کو ساتھ لے جاتے۔ میں بھی ایسی تقریبات سے گریز ہی کرتا ہوں لیکن خواجہ صاحب نے کہ خود بھی اس میں جانا چاہتے تھے، مجھ سے بھی اصرار کیا، چناں چہ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا اور پاشا رحمٰن (انکم ٹیکس آفیسر اور شاعر، جن کے نام معاصر کا پہلا شمارہ معنون تھا۔) اور اظہر الحق حقی بھی ہمارے ساتھ چلے۔ اس تقریب میں ہونا کیا تھا، ظاہر ہے تعریفیں ہوتی رہیں اور عطاالحق قاسمی کے عزم اور حوصلے کو داد دی جاتی رہی کہ اتنا ضخیم' متنوع اور پرکشش رسالہ جاری کیا ہے۔ خواجہ صاحب اس بات سے متفق نہ تھے یا زیادہ خوش نہ تھے۔ رسالہ دیکھتے ہی انھوں نے کسی مثبت تاثر کا اظہار نہ کیا تھا۔ دوران تقریب بھی وہ دبے لفظوں میں استہزا ہی کرتے رہے لیکن تقریب کے بعد ہم وہاں سے نکل کر آرٹس کونسل کے ریسٹوران میں چائے پینے کے لیے پہنچے اور وہاں کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ اس وقت دوران گفتگو خواجہ صاحب نے کھلے لفظوں میں کہا کہ معاصر میں کوئی خاص بات نہیں، اس سے اچھا رسالہ تو میں نکال سکتا ہوں۔ چناں چہ یہ جملہ تخلیقی ادب کے اجرا کا محرک ثابت ہوا۔ پھر انھوں نے زیادہ وقت بھی نہ لگایا اور ایک ہی سال میں، ۱۹۸۰ء میں، اس کے بیک وقت دو شمارے مرتب کر لیے اور شائع بھی کر دیے۔

وہ دن تھا اور اس کے بعد کئی برسوں تک مشفق خواجہ بس تخلیقی ادب کے ہو کر رہ گئے۔

اب ان کی گفتگو کا محور، ان کے معمولات، ان کی دل چسپیاں سب *کچھ تخلیقی ادب* سے منسلک ہو کر رہ گئیں۔ اب ان کا اوڑھنا بچھونا *تخلیقی ادب* کے نکالنے، اس کے لیے ہر طرف سے، ہر ایک سے، مضامین اور نگارشات حاصل کرنے اور اس کے متعلقہ انتظامات میں سمٹ کر رہ گیا۔ جتنے عرصے تک *تخلیقی ادب* نکلتا رہا، ان کی ساری سرگرمیوں اور گفتگو کا محور وہی رہا۔ ان کے معمولات بھی اسی کے گرد گھومتے رہے۔ اس وقت سے تحقیق سے ان کا رشتہ قریب قریب ٹوٹ گیا۔ *جائزۂ مخطوطات* کی تکمیل کے لیے وہ روز عجائب گھر جایا کرتے تھے اب وہ موقوف ہو گیا۔ اب جب مجھ جیسے نیاز مند ان *جائزہ* کی دوسری جلد اور *تذکرہ* کے تعلیقات کا ذکر چھیڑتے اور استفسار کرتے تو شاید اس کا اثر تھا کہ انھوں نے پہلے *غالب* اور *صفیر بلگرامی* سے متعلق اپنے مقالات کو یکجا کر کے پہلے یہ کتاب اور پھر دیگر مقالات کو جمع کر کے *تحقیق نامہ* شائع کر دیا، یا پھر احمد دین کی کتاب کا مقدمہ مکمل کر کے اس کتاب کو چھپوا دیا، لیکن نامکمل کاموں اور اگلے منصوبوں کی طرف سے ان کی توجہ ہٹ گئی اور پھر کبھی وہ کسی تشنہ یا زیر نظر منصوبے، جیسے *تذکرۂ بشیر* کی تدوین، کی طرف متوجہ نہ ہوئے۔ *جائزہ مخطوطات* کے کام کے دوران انھیں جہاں *تذکرۂ بشیر* میں کشش محسوس ہوئی تھی وہیں ایک نادر لکھنوی روزنامچے *فرمانِ سلیمانی* کو بھی مرتب کرنے کا پختہ ارادہ انھوں نے کر لیا تھا۔ اسی طرح وہ اپنے والد خواجہ عبدالوحید کی *ڈائری* یا *دایام* کو بھی مرتب کرنے کے لیے مواد یکجا کرتے رہے۔ مؤخر الذکر دونوں کاموں کو وہ *تخلیقی ادب* کے بند ہونے کے بعد کہیں شروع کر سکے لیکن ان کی حیات تک ان کی نوک پلک درست نہ ہو سکی، جس کا اندازہ ان کے انتقال کے بعد ان دونوں روزنامچوں کے شائع ہونے سے ہوتا ہے [۱۷]۔ حقیقتاً ان دونوں کے حواشی اور تعلیقات' جو اگر اتنے ہی تھے جو شائع ہوئے ہیں، تو نہیں لگتا کہ یہ مشفق خواجہ کے شایانِ شان تھے۔ یہ اس لیے ہوا کہ خواجہ صاحب کے تحقیقی مزاج اور معیار کا وہ تسلسل' جو ان کے اولین کاموں کے وقت تھا' وہ *تخلیقی ادب* سے ''ہنی مون'' کے زمانے میں ٹوٹ گیا تھا، اور پھر کبھی بحال نہ ہو سکا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ *تخلیقی ادب* نے بلکہ معاصر اور عطا الحق قاسمی نے دراصل ایک بڑے محقق کو تحقیق کے ''خارزاروں'' سے نکال کر ایک عمومی ادبی حلقے میں، جو پاکستان سے نکل کر بھارت تک میں وسعت اختیار کر گیا تھا، شہرت، مقبولیت اور تحسین و ستایش کے نشے سے سرشار کر دیا کہ تحقیق، یہاں تک کہ تشنہ اور باقی ماندہ منصوبے بھی، اس کے لیے اب وہ نہ رہے، جو کبھی ہوا کرتے تھے۔

اس پر مستزاد مشفق خواجہ کے لیے ادا جعفری کا اسلام آباد سے مستقلاً کراچی منتقل ہو جانا بھی ایک بڑا ''حادثہ'' ثابت ہوا! ایک اچھی اور سنجیدہ شاعرہ کے علاوہ ادا جعفری ایک عمدہ منتظم اور سماجی لحاظ سے ایک بھرپور شخصیت کی حیثیت میں اسلام آباد کے ادبی حلقوں میں معروف اور سرگرم رہیں، اور ایک مخصوص و محدود حلقے میں وہاں ایک 'حلقہ' یا 'دائرہ' یا 'سلسلہ' کی صورت میں ادیبوں اور دانش وروں کے گھریلو اجتماعات کا اہتمام اس حلقے سے وابستگان کے دولت کدوں پر کرواتی رہیں۔ ان کے خاوند نورالحسن جعفری (۱۹۹۵ء۔۱۹۲۱ء) سرکار دربار میں اپنے سرکاری منصب کی وجہ سے قدر و منزلت اور رسائی رکھتے تھے۔ اس لیے اسلام آباد کا مؤقر طبقہ ان کے حلقے میں شامل تھا۔ اس حلقے کے اجتماعات کی شہرت کراچی تک پہنچی ہوئی تھی۔ نورالحسن جعفری صاحب کی ملازمت سے سبک دوشی کے بعد یہ میاں بیوی ۱۹۸۱ء میں اپنی مستقل رہائش گاہ کراچی میں منتقل ہو گئے اور یہاں آنے کے بعد انھوں نے اس حلقے کی کراچی میں ترتیب نو کی، جس کے نتیجے میں یہاں کے اکابر ادیبوں اور دانش وروں کے اجتماعات کا ایک سلسلہ یہاں بھی شروع ہو گیا۔ مرزا ظفرالحسن مرحوم، جو بوجوہ اس حلقے میں متواتر شریک نہ ہوتے' اس کو بطور مذاق ''امپیریل ادیبوں کا حلقہ'' کہا کرتے تھے۔ راقم کو بھی اس حلقے میں دو ایک بار شرکت کا موقع ملا ہے۔

یہ اجتماعات متعلقہ اراکین کے دولت کدوں پر یکے بعد دیگرے منعقد ہوتے اور ان کا درمیانی وقفہ بالعموم دو تین ہفتوں یا ایک ماہ تک ہوتا تھا۔ ہر رکن مع شریک حیات اس میں شریک ہوتا اور اپنے ساتھ کوئی ایک چیز پکا کر لاتا اور سب مل کر اپنے اپنے ساتھ لائے ہوئے انواع و اقسام کے کھانوں سے شاد کام ہوتے، عمدہ عمدہ گفتگوئیں رہتیں اور کبھی کوئی بیرونی مہمان کسی ملک یا شہر سے آ جاتا تو اسے بھی مدعو کر لیا جاتا اور اس سے اس کی تخلیقات بھی سنی جاتیں۔ ادا جعفری نے آتے ہی مشفق خواجہ کو بھی اس حلقے کا رکن بنا لیا۔ ایک تو شام کا وقت' اچھی پر لطف محفل' عمدہ صحبت اور پھر ہم ذوق اور ہم مزاج افراد کا اجتماع، یہ دوسرا محرک ہے جس نے خواجہ صاحب کو ان کے اپنے معمولات سے دور کر دیا۔ پہلے وہ کبھی کبھار شاموں میں تقریبات میں شریک ہوا کرتے تھے' اب وہ تواتر سے' بلاناغہ حلقے کی ان محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ پھر یہی نہیں بل کہ اس حلقے کے وابستگان کی ذاتی اور نجی تقریبات میں بھی اب شرکت کرنے پر مجبور یا آمادہ ہونے لگے۔

چناں چہ اب ان کی شامیں ایسی ہی تقریبات میں گزرنے لگیں اور دن میں بھی وہ اس حلقے کے اراکین سے کسی سبب ملنے ملانے پر مجبور ہوتے رہے۔ اب اس طرح تحقیق کے لیے جو یکسوئی، دل جمعی اور مستقل مزاجی ضروری تھی اور جو آزادانہ وقت اس کے لیے لازمی تھا، اب خواجہ صاحب کی ترجیحات میں نہ رہا۔ اب ان کی شامیں غالب لائبریری میں نہ گزرتیں اور دن تحقیق کی گتھیوں میں نہ الجھتا۔ تخلیقی ادب کے بعد اس حلقے یا سلسلے نے انھیں تحقیق سے مزید دور کر دیا۔ اب ان کا قدیمی حلقۂ احباب بھی وہ نہ رہا جن سے صحبتوں اور ملاقاتوں میں تحقیقی معاملات اور منصوبے اور مآخذ و مصادر زیرِ گفتگو رہتے، اب خواجہ صاحب کی صحبتوں میں وہ لوگ رہتے یا خواجہ صاحب اب ان لوگوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے جن کو تحقیق سے کوئی دل چسپی اور موانست نہ تھی۔ تحقیقی معمولات اور مزاج پر یقیناً صحبتوں کی اس تبدیلی کا اثر بھی ایک قابلِ فہم امر ہے۔

تخلیقی ادب نے سات آٹھ سال مشفق خواجہ کو اپنے جال یا سحر میں گھیرے رکھا تھا۔ مالی وسائل جب مسئلہ بننے لگے اور پھر جب *تخلیقی ادب* کی مقبولیت و شہرت بھی اپنے بامِ عروج پر پہنچ گئی اور اب اس میں مزید کسی عروج یا افادیت کا امکان نہ رہا تو خواجہ صاحب نے اس کی طرف سے توجہ کم کر لی اور اسے غالب لائبریری کے مجلّے *غالب* میں ایک طرح سے ضم کر دیا' جس کا مجموعی مزاج، مرزا ظفر الحسن کے انتقال اور ان کے دور کے مجلّہ سہ ماہی *غالب* کے بند ہونے کے بعد، خواجہ صاحب کی زیرِ نگرانی *تخلیقی ادب* کے عین مطابق رہا۔ اور جو ایک نفسیاتی تسکین کا عنصر *تخلیقی ادب* میں انھیں مل رہا تھا' وہ اب *غالب* سے حاصل ہونے لگا۔ اگرچہ حلقے یا سلسلے کی تقریبات بھی نور الحسن جعفری کی رحلت کے بعد اور ادا جعفری صاحبہ کی ضعیف العمری کی وجہ سے تواتر میں نہ رہیں۔ لیکن انھوں نے مشفق خواجہ کے مزاج و معمولات اور دل چسپیوں و دل بستگیوں میں جو انقلاب پیدا کر دیا تھا' ان سے واپسی خواجہ صاحب کے لیے ممکن نہ رہی۔ پھر اب یہ دوران کی علالت و عوارض کا دور بھی ہے۔ *تخلیقی ادب* اور حلقے اور سلسلے کو غیر شعوری طور پر جو کچھ خواجہ صاحب سے لینا تھا' لے لیا۔ اب ان کی دیرینہ بیماری ذیابیطس اور اس سے لاحق عوارض نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ تحقیق کے لیے جو انہماک، لگن، جستجو اور مستقل مزاجی ضروری تھی وہ اب باقی نہ رہی۔ ان سب نے مل کر دراصل ہم سے ایک ایسے شخص کو چھین لیا' جس میں اپنے دور کا ایک بڑا محقق بننے کے سارے امکانات موجود تھے۔ ان کی زندگی کے یہ انقلابی موڑ دورِ حاضر کی

اردو تحقیق کے لیے مایوس کن بلکہ الم ناک ثابت ہوئے۔ معاصر نے خواجہ صاحب کی زندگی بدل کر رکھ دی اور پھر رہی سہی کسر ادا جعفری کے حلقے یا سلسلے نے پوری کر دی۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ مشفق خواجہ، *ابیات* (کراچی: مکتبہ نیا دور، ۱۹۷۸ء)؛ دوسری اشاعت خواجہ صاحب کے برادر خورد عبدالرحمن طارق نے خود اپنی دل چسپی سے شائع کی (لاہور: القمر انٹر پرائز، ۲۰۰۹ء)۔

۲۔ مشفق خواجہ، *جائزہ مخطوطات اردو* (لاہور: مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۷۹ء)۔

۳۔ مشفق خواجہ، *تحقیق نامہ* (لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء)۔

۴۔ مشفق خواجہ، *غالب اور صفیر بلگرامی* (کراچی: عصری مطبوعات، ۱۹۸۱ء)۔

۵۔ مشفق خواجہ، مرتب *تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا*، جلد اول (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء؛ جلد دوم ۱۹۷۲ء)۔

۶۔ احمد دین، *اقبال*، مرتبہ مشفق خواجہ (کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء)۔

۷۔ مشفق خواجہ، مرتب *کلیات یگانہ* (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳ء)۔

۸۔ مشفق خواجہ، ''علم الاقتصاد: اقبال کا پہلا علمی کارنامہ،'' *اردو* (جولائی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء): ۱۷۸۔۱۹۱؛ مشفق خواجہ، ''خطاطی کے چند نادر نمونے،'' *اردو* (جولائی۔ ستمبر ۱۹۶۶ء): ۴۳۔۲۹؛ مشفق خواجہ، ''گلشن سخن پر ایک نظر،'' *اردو* (جولائی۔ ستمبر ۱۹۶۷ء): ۱۴۶۔۱۳۳؛ مشفق خواجہ، ''مرزا محمد قزلباش خان امید،'' *اردو* (اپریل۔ جون ۱۹۷۷ء): ۵۹۔۲۵۔

۹۔ مشفق خواجہ، ''غالب اور صفیر بلگرامی،'' *صحیفہ* (جولائی ۱۹۶۹ء): ۷۲۔۴۰؛ قسط دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء): ۲۹۔۱۔

۱۰۔ مشفق خواجہ، ''اقبال اور مولوی احمد دین،'' *اقبال ریویو* (جولائی ۱۹۶۷ء): ۷۰۔۲۳۔

۱۱۔ موقر جرمن مستشرق Carl Brokelmann: جس کی بنیادی شہرت عربی مخطوطات کے معروف کیٹلاگ

Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplementbänden angepaßte Auflage

کے باعث ہے۔ اس کیٹلاگ کی ترتیب کا آغاز ۱۸۹۸ء سے شروع ہوا تھا جب کہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک اس کی دو ضخیم جلدیں اور ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۹ء تک ان کے تین ضخیم ضمیمے E.J. Brill لائڈن سے شائع ہوئے۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے شاگردوں نے اس سلسلے کو جاری رکھا اور دس تازہ ضخیم جلدوں میں اسے مرتب کیا۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں اس کیٹلاگ اور اس میں عربی زبان و ادب اور علوم پر پیش کردہ معلومات اور اسکالرشپ کی ایسی کوئی نظیر موجود نہیں۔ یا

عالمی سطح پر عربی کے تعلق سے اس سے بہتر اور معلوماتی ومحققانہ کیٹلاگ کوئی اور نہیں۔

۱۲۔ ممتاز انگریز اسکالر، C. A. Storey جس نے فارسی زبان وادب اور علوم کا کیٹلاگ:

Persian Literature: A Bio-Bibliographical Survey

مرتب کیا جو متعدد جلدوں میں شائع ہوا۔ پہلی جلد ۱۹۵۳ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن سے شائع ہوئی تھی، جب کہ اسٹوری کی وفات کے بعد اس کی یادداشتوں کی بنیاد پر، بقیہ جلدیں سوسائٹی سے منسلک اسکالر جیسے **Francois de Blois** تا حال مرتب اور شائع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کی جلد پنجم، حصہ سوم ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کیٹلاگ فارسی زبان وادب اور علوم پر مبنی مخطوطات ومطبوعات اور ان کے مصنفین کے احوال وآثار کے لیے بے حد معلوماتی ومفید ہے۔

۱۳۔ مشفق خواجہ، ''جسونت سنگھ پروانہ،'' (جنوری۔مارچ، ۱۹۷۵ء): ۱۱۷۔۸۴؛ مشفق خواجہ، ''ثناء اللہ خاں فراق،'' (اپریل تا جون ۱۹۷۵ء): ۸۱۔۴۹؛ مشفق خواجہ، ''حافظ فضل علی ممتاز،'' (جولائی۔ستمبر ۱۹۷۵ء): ۴۴۔۲۵؛ مشفق خواجہ، ''خواجہ احسن الدین خان بیان،'' (جنوری۔مارچ ۱۹۷۶ء): ۱۷۹۔۱۴۳۔

۱۴۔ مشفق خواجہ، ''نگارستانِ بشیر،'' *اردو* (جنوری۔مارچ، ۱۹۷۱ء): ۸۷۔۶۹۔

۱۵۔ مشفق خواجہ، ''گلشنِ مشتاق،'' *اردو* (اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۷۴ء): ۴۲۔۱۷۔

۱۶۔ معین الدین عقیل، ''مشفق خواجہ کے آخری دس دن،'' *مکالمہ* ۱۵ (جولائی ۲۰۰۵ء۔جون ۲۰۰۶ء): ۱۹۲۔۱۸۵؛ معین الدین عقیل، ''رقعاتِ مشفق خواجہ،'' *الزبیر* ۳۔۴ (اکتوبر ۲۰۰۷ء): ۹۶۔۸۰۔

۱۷۔ خواجہ عبدالوحید، *یادِ ایام*، مرتبہ، مشفق خواجہ (کراچی: شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۶ء)؛ آغا حسن امانت، ''فرمان سلیمانی''، مرتبہ، مشفق خواجہ *جریدہ* ۳۷ (۲۰۰۶ء): ۱۹۷۔۲۱؛ اولاً اس کا مقدمہ ایک مقالے کے طور پر شائع کرایا تھا: ''فرمان سلیمانی،'' *نذرِ حمید*، مرتبہ، مالک رام (دہلی: مجلس نذر حمید، ۱۹۸۱ء)، ۳۵۴۔۳۰۵۔

مآخذ

امانت، آغا حسن۔ ''فرمان سلیمانی۔'' *جریدہ* ۳۷ (۲۰۰۶ء): ۱۹۷۔۲۱۔

خواجہ، مشفق۔ *ابیات*۔ کراچی: مکتبۂ نیا دور، ۱۹۷۸ء۔

خواجہ، مشفق۔ *ابیات*۔ اشاعت دوم۔ لاہور: القمر انٹر پرائز، ۲۰۰۹ء۔

خواجہ، مشفق۔ *تحقیق نامہ*۔ لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۱۹۹۱ء۔

خواجہ، مشفق۔ *جائزۂ مخطوطات اُردو*۔ لاہور: مرکزی اُردو بورڈ، ۱۹۷۹ء۔

خواجہ، مشفق۔ *غالب اور صفیر بلگرامی*۔ کراچی: عصری مطبوعات، ۱۹۸۱ء۔

خواجہ، مشفق۔ مرتبہ *تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا*۔ جلد اول۔ لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۰ء۔

خواجہ، مشفق۔ مرتبہ *کلیات یگانہ*۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۳ء۔

خواجہ، مشفق۔ ''اقبال اور مولوی احمد دین۔'' *اقبال ریویو* (جولائی ۱۹۶۷ء): ۷۰۔۲۳۔

خواجہ، مشفق۔ ''ثناء اللہ خاں فراق۔'' *غالب* (اپریل تا جون ۱۹۷۵ء): ۸۱۔۴۹۔

خواجہ، مشفق۔ ''جسونت سنگھ پروانہ۔'' *غالب* (جنوری۔ مارچ، ۱۹۷۵ء): ۱۱۷۔۸۴۔

خواجہ، مشفق۔ ''حافظ فضل علی ممتاز۔'' *غالب* (جولائی۔ ستمبر ۱۹۷۵ء): ۴۴۔۲۵۔

خواجہ، مشفق۔ ''خطاطی کے چند نادر نمونے۔'' *اردو* (جولائی۔ ستمبر ۱۹۶۶ء): ۴۳۔۲۹۔

خواجہ، مشفق۔ ''خواجہ احسن الدین خان بیان۔'' *غالب* (جنوری۔ مارچ ۱۹۷۶ء): ۱۷۹۔۱۴۳۔

خواجہ، مشفق۔ ''علم الاقتصاد: اقبال کا پہلا علمی کارنامہ۔'' *اردو* (جولائی۔ اکتوبر ۱۹۶۰ء): ۱۷۸۔۱۶۱۔

خواجہ، مشفق۔ ''غالب اور صفیر بلگرامی۔'' *صحیفہ* (جولائی ۱۹۶۹ء): ۲: ۷۲۔۴۰: قسط دوم (اکتوبر ۱۹۶۹ء): ۲۹۔۱۔

خواجہ، مشفق۔ ''فرمان سلیمانی۔'' *نذر حمید*، مرتبہ مالک رام (دہلی: مجلس نذر حمید، ۱۹۸۱ء)، ۳۵۴۔۳۰۵۔

خواجہ، مشفق۔ ''گلشن سخن پر ایک نظر۔'' *اردو* (جولائی۔ ستمبر ۱۹۶۷ء): ۱۴۶۔۱۳۳۔

خواجہ، مشفق۔ ''گلشنِ مشتاق۔'' *اردو* (اکتوبر تا دسمبر، ۱۹۷۴ء): ۴۲۔۱۷۔

خواجہ، مشفق۔ ''مرزا محمد قزلباش خان امید۔'' *اردو* (اپریل۔ جون ۱۹۷۷ء): ۵۹۔۲۵۔

خواجہ، مشفق۔ ''نگارستان بشیر۔'' *اردو* (جنوری۔ مارچ، ۱۹۷۱ء): ۸۷۔۶۹۔

دین، احمد۔ *اقبال*۔ مرتبہ مشفق خواجہ۔ کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء۔

عبدالوحید، خواجہ۔ *یادِ ایام*، مرتبہ مشفق خواجہ (کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۶ء)۔

عقیل، معین الدین۔ ''رقعاتِ مشفق خواجہ۔'' *الزبیر* ۳۔۴ (اکتوبر ۲۰۰۷ء): ۹۶۔۸۰۔

عقیل، معین الدین۔ ''مشفق خواجہ کے آخری دس دن۔'' *مکالمہ* ۱۵ (جولائی ۲۰۰۵ء۔ جون ۲۰۰۶ء): ۱۹۲۔۱۸۵۔

Brokelmann, Carl. *Geschichte der Arabischen Litteratur. Zweite den Supplementbänden angepaßte Auflage*. Leiden: E. J. Brill.

Storey, C. A. *Persian Literature: A Bio-Bibliographical Survey*. London: Royal Asiatic Society.

مشفق خواجہ کے چند منتخب کالم

راشد اشرف۔ ۱۲ جون، ۲۰۱۴

کراچی

zest70pk@gmail.com

www.wadi-e-urdu.com

ادب اور تجارت

جب سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ادیبوں کی بآسانی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ایک عجیب وغریب صورتِ حال سامنے آئی ہے۔ دونوں طرف ''ادیبوں'' کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا ہے جو ''ادب برائے ادب'' یا ''ادب برائے زندگی'' کی بحث میں نہیں پڑتا اور صرف ''ادب برائے سفر'' کا قائل ہے۔ دونوں ملکوں کے ادیبوں کا میل جول اچھی چیز ہے اور اس کے کچھ فائدے بھی ہیں، لیکن نقصانات زیادہ ہیں۔ فائدے ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنوائے جا سکتے ہیں لیکن نقصانات گنوانے کے لیے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کی انگلیاں بھی کم پڑیں گی۔ ہم ان ادیبوں کی بات نہیں کرتے جن کی ادبی حیثیت مسلمہ ہے اور جو دوسرے ملک میں جا کر اپنے ملک کا نام روشن کرتے ہیں۔ بات ان ''ادیبوں'' کی ہے جن کا ادب سے کوئی جائز تو کیا، ناجائز تعلق بھی نہیں ہے۔ انھیں اپنے ملک میں کوئی نہیں جانتا، لیکن دوسرے ملک کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ ''مشاہیرِ ادب'' میں شمار ہونے لگتے ہیں۔

دونوں ملکوں میں میزبانی کا جذبہ فراواں ہے۔ ''مشاہیرِ ادب'' اسی جذبے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان خود ساختہ ادیبوں کی دونوں ملکوں میں خوب پذیرائی ہوتی ہے۔ ان کے اعزاز میں جلسے ہوتے ہیں، اخباروں میں انٹرویو چھپتے ہیں، کتابوں کے تحفے ملتے ہیں۔ ہندوستان اس سلسلے میں ایک قدم آگے ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس سے ان مشاہیر کے انٹرویو نشر ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنے گناہ گار کانوں سے ایک پاکستانی ''ادیب'' کا انٹرویو سنا ہے، جس میں انھوں نے سوالوں کے جواب اس طرح دیئے جیسے انٹرویو نہ ہو، کوئی مزاحیہ پروگرام ہو۔ مثلاً اُن سے سوال کیا گیا، ''پاکستانی ادب کے تازہ ترین رجحانات کیا ہیں؟'' انھوں نے جواب دیا، ''میں پرسوں ہی کراچی سے دہلی پہنچا ہوں۔ پرسوں تک کوئی تازہ رجحان پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان دو دنوں میں کوئی نیا رجحان پیدا ہو گیا ہو تو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

جیسے یہ پاکستانی ادیب تھے، ویسے ہی ایک ہندوستانی ادیب پچھلے دنوں کراچی تشریف لائے۔ کئی علمی وادبی اداروں نے ان کے اعزاز میں تقاریب منعقد کیں۔ اخباروں میں خبریں اور تصویریں شائع ہوئیں۔ تقریباً ہر اخبار کے ادبی صفحے پر ان کا انٹرویو چھپا۔ یہ دھوم دھام دیکھ کر ہم خاصے مرعوب ہوئے اور سوچا کہ کیوں نہ اپنے کالم کے لیے ہم ان کا انٹرویو لے لیں۔ ہم نے ان کے میزبان سے فون پر رابطہ قائم کیا اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے نہایت حقارت سے فرمایا، ''آپ اخبار والوں نے معزز مہمان کو بہت پریشان کر دیا ہے۔ انھیں کسی لمحے آرام تو کرنے دیجیے۔'' بڑی مشکل سے ہم نے میزبان کو شیشے میں اتارا۔ انھوں نے اس شرط پر انٹرویو لینے کی اجازت دی کہ انٹرویو کے ساتھ جو تصویر چھپے گی، اس میں مہمان اور میزبان دونوں ہوں گے۔ ہم وقتِ مقررہ پر مہمان عزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں اور ہم میں مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

ہم: ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے ملک میں تشریف لائے ہیں، اس سفر کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟

وہ: سب کچھ ٹھیک ہے، مگر آپ کے ہاں پان اچھے نہیں ملتے۔ مجھے سالم پتا کھانے کی عادت ہے اور آپ کے ہاں ذرا ذرا سی کترنیں ملتی ہیں۔

ہم: تو آپ اپنے ساتھ کچھ پان لیتے آتے۔

وہ: لایا تو تھا، لیکن وہ بارڈر پر ہی رہ گئے۔

ہم: کسٹم والوں نے چھین لیے ہوں گے۔

وہ: ان کی کیا مجال کہ میرے مال پر ہاتھ ماریں۔ میں پان لایا ہی اس خیال سے تھا کہ کچھ رقم ہاتھ آجائے گی۔ گاہک بارڈر پر مل گیا۔

ہم: آپ اور کیا کیا چیزیں لائے تھے؟

وہ: بہت کچھ تھا۔ چھالیہ، الائچی، کاجو، ساریاں، مصنوعی زیورات، مگر اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ آپ بہت دیر میں تشریف لائے۔ سب چیزیں فروخت ہو چکی ہیں۔

ہم: اس وقت تو آپ سے ادبی گفتگو کرنے کا ارادہ ہے۔

وہ: صاحب جب سے میں یہاں آیا ہوں ہر شخص مجھ سے ادبی گفتگو کر رہا ہے۔ کام کی بات

کوئی نہیں کرتا۔ آپ بھی اپنا شوق پورا کر لیجیے۔

ہم: یہ فرمائیے ہندوستان میں اُردو کا کیا حال ہے؟

وہ: بہت عمدہ حال ہے۔

ہم: کچھ تفصیل بتائیے۔

وہ: جس ملک میں مجھ جیسے اُردو کے شاعر ہوں گے، وہاں اس زبان کا حال اچھا ہی ہوگا۔ بُرا حال ہوتا تو میں کسی اور زبان میں شعر کہتا۔

ہم: سنا ہے آپ کے ملک میں بے شمار اُردو اکیڈیمیاں ہیں؟

وہ: آپ نے سنا ہی سنا ہے، میں تو دیکھتا رہتا ہوں۔ ہر سو میل کے فاصلے پر ایک اُردو اکیڈیمی ہے۔ اور جہاں اُردو اکیڈیمی نہیں، انجمن ترقی اُردو کی شاخ ہے۔

ہم: ان اُردو اکیڈیمیوں کے بارے میں کچھ بتائیے۔

وہ: کیوں بتاؤں؟ آپ کو ان اکیڈیمیوں سے کیا لینا ہے؟

ہم: لینا تو کچھ نہیں۔ اگر ان کی کارگزاری معلوم ہو جائے تو اچھا ہے۔

وہ: یہ اکیڈیمیاں کتابیں چھاپتی ہیں اور گودام بھرتی ہیں۔ جن کتابوں کے لیے گودام میں جگہ نہیں ہوتی، ان پر انعام دے دیتی ہیں۔

ہم: آپ کے ملک میں اب تک کتنی اُردو کتابوں پر انعام مل چکا ہے؟

وہ: اُردو کی کوئی کتاب ایسی نہیں جو چھپی ہو اور اُسے انعام نہ ملا ہو۔ اِدھر کتاب چھپی، اُدھر انعام کا اعلان ہوا۔ بلکہ اب تو یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اُن کتابوں پر بھی انعام دیا جائے جو کسی وجہ سے لکھی نہ جا سکیں۔

ہم: آپ کی بھی کسی کتاب پر انعام ملا ہے۔

وہ: میں انعام کے لیے نہیں لکھتا۔ میں نے اب تک اِسی خیال سے اپنی کوئی کتاب نہیں چھاپی کہ کہیں اس پر انعام نہ مل جائے۔

ہم: کیا آپ نے کوئی کتاب لکھی ہے؟

وہ: میں کاغذ پر نہیں لکھتا، دلوں پر اپنا کلام تحریر کرتا ہوں۔ یعنی مشاعروں میں پڑھتا ہوں۔ پورے ہندوستان میں میرا کلام شوق سے سنا جاتا ہے۔ اور اب تو آپ کے ملک میں بھی

میرے مدّاح لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ میں ہندوستان کے چند بڑے شاعروں میں سے ہوں۔

ہم: کیا آپ اُن چند بڑے شاعروں کے نام بتائیں گے۔

وہ: میں کسی کا نام لے کر اُسے رسوا نہیں کرنا چاہتا۔

ہم: پاکستان میں آپ کی تشریف آوری کا سبب کیا ہے؟ کیا آپ اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

وہ: جی نہیں۔ میں خالصۃً ادبی وجوہ کی بنا پر یہاں آیا ہوں۔ ''جزیرۂ سخنوراں'' کی طرف سے مجھے یہاں آنے کی دعوت ملی تھی۔

ہم: ''جزیرۂ سخنوراں'' تو غلام عباس کی کتاب کا نام ہے۔

وہ: کون غلام عباس؟ حیرت ہے کہ آپ ''جزیرۂ سخنوراں'' سے واقف نہیں۔ یہ آپ کے ملک کا سب سے بڑا ادبی ادارہ ہے جس کی طرف سے ہر سال مشاعرہ ہوتا ہے۔ مجھے اس مشاعرے میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس ادارے کے سیکرٹری میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔

ہم: سیکرٹری صاحب کا احسان ہے کہ ان کی وجہ سے ہم اہلِ پاکستان کو آپ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا۔

وہ: کاہے کا احسان! میں نے بھی اپنے شہر میں ایک ادبی ادارہ بنا رکھا ہے۔ اس کی طرف سے بھی ہر سال مشاعرہ ہوتا ہے۔ اس مشاعرے میں مَیں ''جزیرۂ سخنوراں'' کے سیکرٹری کو بلاتا رہتا ہوں۔ اس کے جواب میں اگر انھوں نے مجھے بُلا لیا تو کون سا احسان کیا۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔

ہم: اگر آپ اجازت دیں تو کچھ ہندوستانی ادب کے بارے میں گفتگو ہو جائے۔

وہ: اجازت ہی اجازت ہے۔

ہم: ہندوستان میں اُردو افسانہ نگاری کے بارے میں کچھ بتائیے۔

وہ: میرے نزدیک افسانہ نگاری خرافات کا درجہ رکھتی ہے۔ جسے کوئی کام نہیں ہوتا وہ افسانہ نگار بن جاتا ہے۔ میں افسانے پڑھنے میں وقت ضائع نہیں کرتا۔

ہم: کیا آپ نے کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانے بھی

نہیں پڑھے؟

وہ: پہلے دو نام تو میں نے کبھی نہیں سنے۔ ہاں بیدی صاحب کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے کرم فرما ہیں۔ وہ جن مشاعروں کی صدارت فرماتے ہیں، ان کے منتظمین مجبور ہو کر مجھے دعوت نامہ بھجواتے ہیں۔ پاکستان کے لیے ویزا بھی انھیں کی سفارش پر ملا تھا۔

ہم: آپ شاید کنور مہندر سنگھ بیدی کا ذکر کر رہے ہیں، بات راجندر سنگھ بیدی کی ہو رہی تھی۔

وہ: آپ پاکستانیوں کی لاعلمی پر ہنسی آتی ہے۔ کنور صاحب ایک ہی ہیں۔ ان کا نام مہندر سنگھ بیدی ہے۔ بعض لوگ انھیں راجندر سنگھ بیدی بھی کہتے ہیں۔

ہم: راجندر سنگھ بیدی بہت بڑے افسانہ نگار تھے۔ چند برس پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

وہ: آپ اپنی ہانکے جا رہے ہیں۔ میں ابھی دو ہفتے پہلے بیدی صاحب سے ملا ہوں۔ ویزا دلانے کے لیے وہ خود میرے ساتھ پاکستانی سفارت خانے گئے تھے۔ آپ کے سفیر نے اپنی کرسی سے اُٹھ کر اُن کا استقبال کیا تھا۔

ہم: آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ کی وجہ سے ایک بہت بڑی غلط فہمی دور ہو گئی، ورنہ پاکستان میں عام طور پر مہندر سنگھ بیدی اور راجندر سنگھ بیدی کو الگ الگ شخصیات سمجھا جاتا تھا۔

وہ: آپ لوگوں کو ہندوستان کے ادب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

ہم: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کتابیں یہاں نہیں ملتیں۔

وہ: اچھا ہی ہے جو نہیں ملتیں۔ انھیں وہاں کوئی نہیں پڑھتا تو آپ پڑھ کر کیا کریں گے۔

ہم: دونوں ملکوں میں کتابوں کا لین دین تو ہونا چاہیے۔

وہ: لین دین اس چیز کا ہوتا ہے جس کی مارکیٹ ویلیو ہو۔ میں اگر اپنے ساتھ کتابیں لے کر آتا تو وہ پڑی کی پڑی رہ جاتیں، کوئی نہ خریدتا۔ پان، چھالیہ اور کاجو وغیرہ ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔

ہم: یہاں سے آپ کیا لے کر جائیں گے؟

وہ: آپ کے ہاں غیر ملکی کپڑا آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ یہیں سے لے جاؤں۔ وہاں منھ مانگے دام مل جائیں گے۔

ہم: اس کا مطلب یہ ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر سے آپ کا دورہ کامیاب رہا۔

وہ: کیسا کاروبار، کہاں کا کاروبار۔ میں تو ادب کا آدمی ہوں اور ادب ہی کی خاطر یہاں آیا ہوں۔

ہم: آپ کو یہاں تحفے میں کتابیں تو ملی ہوں گی۔

وہ: جی ہاں، جو بھی ملتا ہے، بات بعد میں کرتا ہے پہلے کتاب پیش کرتا ہے۔ دو سو کے قریب کتابیں جمع ہو چکی ہیں۔

ہم: کیا آپ یہ سب کتابیں ساتھ لے جائیں گے؟

وہ: ہمارے ملک میں کیا کتابوں کی کمی ہے جو میں یہ بوجھ ساتھ لے جاؤں۔

ہم: تو پھر آپ ان کتابوں کا کیا کریں گے؟

وہ: میرے میزبان نے کتابوں کا ٹھیلہ لگانے والے ایک شخص سے سودا کر لیا۔ ان شاء اللہ یہیں پاکستان میں یہ کتابیں مستحقین تک پہنچ جائیں گی۔

ہم: واپس جا کر آپ سفرنامہ تو ضرور لکھیں گے۔

وہ: جی ہاں۔ یہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ ذرا اپنا اور اپنے اخبار کا نام ایک کاغذ پر لکھ دیجیے۔ سفر نامے میں آپ کا ذکر بھی کروں گا۔ میں بہت کشادہ دل ہوں۔ جس سے بھی ملاقات ہوتی ہے، اس کا نام نوٹ کر لیتا ہوں تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو کہ میں نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

(۱۶/نومبر ۱۹۸۹ء)

ادبِ عالیہ امام

"مزدور تحریک کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر ہو رہا تھا"۔

"آفتاب کی کرنیں بہت دور دور تک اپنی کرنوں کا جال پھیلا رہی تھیں"۔

"انھوں نے صر صرو سموم سے روغن غذا حاصل کی"۔

"اسلام کا تقدس بے معنی ہے اگر اقتدار چراغوں کی زد پر ہے"۔

ان جملوں میں زبان و بیان کا حسن اور اسلوب کی جو انفرادیت ملتی ہے، اس کی بنا پر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ کس کے اشہبِ جہندۂ قلم نے میدانِ وسیعِ بیان میں یہ گل کترے ہیں (موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی) ممکن ہے بعض لوگوں کا دھیان میر امن دہلوی اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی طرف جائے لیکن ایسی فصیح و بلیغ اردو لکھنا ان دونوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہم اپنے کالم کی تمہید کا پاٹ چوڑے سے چوڑا تر نہیں کرنا چاہتے، اس لیے عرض کیے دیتے ہیں کہ یہ جملے ڈاکٹر عالیہ امام کے ہیں جو ہم نے ان کی کتاب "شاخ ہری اور پیلے پھول" سے کشید کیے ہیں۔ ان جملوں کے انتخاب کے لیے ہم نے دیوانِ حافظ سے فال نکالنے کا طریقہ استعمال کیا ہے۔ آنکھیں بند کرکے ورق گردانی کی اور چار جگہ شہادت کی انگلی رکھ دی۔ مذکورہ چار جملے بس اتنی سی محنت کا حاصل ہیں۔ ان چار جملوں کو محمد حسین آزاد کی زبان میں شہادت گاہِ اردو کے چار ستون سمجھنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحبہ کی کتاب سے ہم نے فال ہی نہیں نکالی، اسے پڑھا بھی ہے۔ بلکہ استاد لاغر مراد آبادی کو بھی یہ کتاب پڑھوا دی ہے۔ استاد نے کتاب پڑھنے کے بعد معاوضہ طلب کیا۔ ہم نے عرض کیا، استاد یہ کتاب ہے، مشاعرہ نہیں جو آپ پڑھنے کا معاوضہ طلب فرما رہے ہیں۔ استاد نے

فرمایا: "جب کاتب لکھنے کا معاوضہ لیتا ہے' پریس والا چھاپنے کی اجرت وصول کرتا ہے' جلد ساز اپنا محنتانہ طلب کرتا ہے تو قاری کو اس کی محنت کے صلے سے کیوں محروم کیا جائے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب کے پڑھنے میں جتنی محنت میں نے کی ہے' اتنی مصنّفہ نے اس کے لکھنے میں نہیں کی"۔

ہم نے اس اجمال کی تفصیل پوچھی تو استاد نے کہا: "کتاب پڑھنے کے دوران بار بار یہ خیال آتا رہا کہ ڈاکٹر صاحبہ نے اسے کیوں لکھا ہے اور میں کیوں پڑھ رہا ہوں۔ کتاب پڑھنے کے بعد یہ عقدہ حل ہوا کہ یہ محض اس لیے لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والوں کے صبر کا امتحان لیا جائے"۔

استاد کی یہ بات ہمارے دل کو نہیں لگی۔ ہمیں تو یہ کتاب بہت پسند آئی ہے۔ اس کا ہر صفحہ معلومات کا خزینہ ہے۔ بہ شرطے کہ اسے دوسرے صفحے سے مربوط نہ سمجھا جائے۔ ن م راشد نے ایک شاعر کے بارے میں کہیں لکھا تھا کہ اس کی نظموں کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی بجائے آخر سے شروع تک پڑھا جائے تو مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم اس پر یہ اضافہ کریں گے کہ اگر ڈاکٹر عالیہ امام کی زیرِ نظر کتاب کو آخری صفحے سے شروع کر کے پہلے صفحے پر ختم کیا جائے تو کتاب کے لطفِ خواندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عالیہ امام بقول خود ادیبہ ہیں' ماہرِ موسیقی ہیں' خطیبہ ہیں' دانش ور ہیں اور سیاست داں ہیں۔ گویا اُن کی شخصیت ایک گل دستہ ہے جس میں رنگ برنگے پھولوں کا اجتماعِ ضدین ہے۔ انھوں نے بقول خود لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس ڈگری کے لیے انھوں نے جو مقالہ لکھا تھا' وہ فیض احمد فیض مرحوم کو برائے اشاعت دیا گیا تھا۔ اس مقالے کو فیض صاحب نے اپنے دلِ ریزہ ریزہ کی طرح گنوا دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ محترمہ کے پاس ڈگری رہ گئی اور وہ چیز گم ہو گئی جس کی بنا پر یہ ڈگری ملی تھی۔ سنا ہے فیض صاحب جس کتاب کی عدم اشاعت کو اردو کے حق میں مفید سمجھتے تھے' اس کا مسودہ عموماً اُن سے گم ہو جاتا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پاکستان آنے کے بعد محترمہ نے بقول خود کراچی اور اسلام آباد کی یونیورسٹیوں اور کئی کالجوں میں ملازمت کی کوشش کی مگر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ انھیں ملازمت سے محروم رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزمائے گئے۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ سرسید گرلز کالج میں پرنسپل کی جگہ کے لیے انٹرویو دینے گئیں تو اُن سے کہا گیا آپ تو بہت قابل ہیں' یہ جگہ آپ کے شایانِ شان نہیں' بہتر ہو گا کہ آپ انٹرویو لینے والوں کے پینل میں شامل ہو جائیں۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنی جگہ کسی اور کو پرنسپل بنوا دیا۔ پھر ایک مرتبہ فیض صاحب نے بڑی کوشش کر کے انھیں پی آئی اے میں ملازمت دلوا دی لیکن تیسرے مہینے جس طرح بغیر وجہ بتائے ملازمت ملی تھی، اسی طرح بغیر وجہ بتائے انھیں ملازمت سے علاحدہ کر دیا گیا۔ یہ سب باتیں ڈاکٹر صاحبہ نے اپنی کتاب میں خود بیان کی ہیں۔ جب حالات ایسے ہوں اور بے روزگاری کے سائے بڑھتے چلے جائیں تو آدمی زندگی کا راستہ بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحبہ نے بھی ملازمت کا خیال دل سے نکال دیا اور سیاست کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ غالب کی کوئے ملامت کی طرح کوئے سیاست میں بھی داخلہ بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ جسے کہیں اماں نہ ملے، اسے یہاں سایۂ دیوار مل جاتا ہے۔

"شاخ ہری اور پیلے پھول" ڈاکٹر عالیہ امام کی آپ بیتی ہے۔ اس ادب عالیہ کو انھوں نے دوستوں کے اصرار پر تخلیق کیا ہے۔ دیباچے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے: "جب مجھ سے میرے دوستوں نے اصرار کیا کہ میں اپنی یادداشتیں تحریر کروں تو مجھے ان کی شوخیِ طبع اور حسِ مزاح خاصی واضح نظر آئی۔ میں اور اپنی یادداشتیں؟ جگ ہنسائی کے علاوہ اور کیا؟"؟

محترمہ کا یہ اعتراف صدق و خلوص پر مبنی ہے۔ ایسے ہی صدق و خلوص کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ کتاب کا نام تلاش کرنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ دیباچے کی ابتدائی سطروں ہی میں "شوخیِ طبع" اور "جگ ہنسائی" کی ترکیبیں موجود تھیں، انھیں بے تکلف کام میں لایا جا سکتا تھا۔ اس طرح کتاب کے نام اور مطالب میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی۔

کتاب کے شروع میں "مایہ ناز" نقاد محمد علی صدیقی کا شکریہ ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

"تنقید کی دنیا میں محمد علی صدیقی ادبی سلیقے، تخلیقی رکھ رکھاؤ اور حکیمانہ ہمہ گیری کی علامت ہیں۔ وہ فن کار کے وجود میں اتر کر ادب اور سماج کے رشتے ڈھونڈتے اور ترسیل کی ناکامی میں تجزیہ بیان کا سراغ لگانا جانتے ہیں... اس شبنمی مزاج ادیب کی کاوشوں سے میری یہ حقیر کوشش ممکن ہو سکی"۔

"حکیمانہ ہمہ گیری" والی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ صدیقی صاحب کی تحریریں "تنقیدی حکمتِ عملی" کا عمدہ نمونہ ہوتی ہیں لیکن یہ "تخلیقی رکھ رکھاؤ" کا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا۔ رکھ رکھاؤ کے لغوی معنی ہیں، دیکھ بھال اور خاطر داری کا برتاؤ۔ گویا تخلیقی رکھ رکھاؤ کا مطلب یہ ہوا کہ محمد علی صدیقی تنقید نہیں لکھتے دوسروں کی خاطر داری کرتے ہیں۔ کم از کم ہم اس بات کو تسلیم نہیں کر

سکتے۔ محمد علی صدیقی پر اس قسم کا الزام لگانا ادبی کفر ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ محمد علی صدیقی "ترسیل کی ناکامی میں عجزِ بیان کا سراغ لگانا جانتے ہیں"۔ نقاد کو سراغ رساں کے منصب پر فائز کر دینا ڈاکٹر عالیہ امام کا معجزۂ بیان ہے، ورنہ صدیقی صاحب سب سے پہلے خود ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب میں "ترسیل کی ناکامی" کا سراغ لگاتے۔

آخری جملے کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ آخر صدیقی صاحب کی کاوشوں سے ڈاکٹر عالیہ امام کی حقیر کوشش کیوں کر ممکن ہو سکی؟ ظاہر ہے کہ صدیقی صاحب نے اس کتاب کا مسودہ تیار کیا ہو گا نہ اس کی کتابت کی ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ نوک پلک درست کی ہو گی۔ لیکن اس کا بھی کوئی داخلی ثبوت نہیں ملتا۔ اب یہ صدیقی صاحب ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کی کاوشوں کے رائیگاں جانے کا سبب کیا ہے۔

کتاب کا نام اگرچہ "شاخ ہری اور پیلے پھول" ہے لیکن یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں کوئی ہری شاخ نظر نہیں آتی ہے نہ کوئی پیلا پھول۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو غیر متعلق باتوں کا جھاڑ جھنکار۔ کہیں موسیقی کی تاریخ اس طرح بیان کی جا رہی ہے کہ اگر پڑھنے والے کو موسیقی سے دلچسپی ہو تو یہ دلچسپی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ کہیں اشتراکیت پر صفحوں کے صفحے اس طرح سیاہ کیے گئے ہیں کہ سیاہ و سفید کا فرق مٹ گیا ہے۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ یومِ میر انیس، جشنِ مجنوں، جشنِ رئیس امروہوی اور پاک و ہند مشاعروں کی رودادوں کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اس قسم کی رودادیں اخباروں کے ادبی صفحات پر تو برداشت کی جا سکتی ہیں لیکن ان کو کسی کتاب کی ضخامت میں اضافے کا سبب بنانا ڈاکٹر عالیہ امام ہی کا حوصلہ ہے۔ یہاں تک بھی معاملہ غنیمت ہے، جلیبے مصنفہ نہ سہی کتاب تو آگے بڑھ رہی ہے، لیکن اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر محمود حسین کی ایک طویل تقریر نظر آئی جس کا موضوع میر انیس ہیں۔ بہت غور کرنے کے بعد بھی یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ اس تقریر کا زیرِ نظر کتاب سے کیا تعلق ہے۔ آخر اس عقدے کو استاد لاغر مراد آبادی نے حل کیا اور بتایا کہ یہ سہوِ قلم ہے۔ جس کاتب نے یہ کتاب لکھی ہے، وہ ڈاکٹر محمود حسین کی تقریروں کا مجموعہ بھی کتابت کر رہا تھا۔ غلطی سے ایک تقریر ڈاکٹر عالیہ امام کی کتاب میں شامل ہو گئی۔ ہم نے عرض کیا: "اتنا طویل سہوِ قلم پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے"۔ انھوں نے فرمایا: "آپ نے تو ایک ایسی کتاب بھی دیکھ لی ہے جو بہ تمام و کمال سہوِ قلم کا نتیجہ ہے"۔ معلوم

نہیں لاغر صاحب کا اشارہ کس طرف تھا۔

زیرِ نظر کتاب کے وہ چند صفحات جن سے مصنّفہ کی ذات پر روشنی پڑتی ہے، بے حد دلچسپ ہیں۔ ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً فیض احمد فیض نے انھیں "طوطیِ پاکستان" کا خطاب دیا تھا۔ اردو میں طوطی بولنے کا محاورہ شاید اسی واقعے کے بعد مروج ہوا ہے۔ ایوب خان نے ڈاکٹر عالیہ امام کو وزارت اور سفارت کی پیش کش کی تھی۔ بھٹو ان محترمہ کو خوب صورت مقرر اور اسکالر کہا کرتے تھے۔ انھوں نے بھی وزارت ان کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ آغا شاہی بھی انھیں سفیر بنانے پر مصرر ہے۔ لیکن محترمہ نے ان تمام پیش کشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اس سے محترمہ کے اعلیٰ کردار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہاں تو وہ معمولی معمولی ملازمتوں کے لیے پریشان رہتی تھیں، اور کہاں بڑے بڑے عہدے ان کی نظر میں حقیر تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ محترمہ اگر ان عہدوں کو قبول کر لیتیں تو ایوب خان اور بھٹو کے اقتدار کی میعاد کم ہو جاتی۔ اس خیال کی تصدیق علامہ نیاز فتح پوری کے ایک قول سے بھی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ علامہ نے فرمایا تھا: "عالیہ ارے عالیہ .... مجھے اگر ایسی بیوی مل جاتی تو اَب تک میری سترہ اٹھارہ برسیاں اطمینان سے ہو جاتیں"۔ (علامہ کا یہ جملہ خود مصنفہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۳۱ پر درج کیا ہے)

لیکن یہ مذاق کی بات تھی۔ علامہ کی اصل رائے کچھ اور تھی جس کا اندازہ ان کی ایک رباعی سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ نیاز فتح پوری ڈاکٹر عالیہ امام سے ملنے کے لیے ان کے گھر گئے۔ محترمہ کے شوہر کاظم امام صاحب تو گھر پر موجود تھے لیکن خود محترمہ غائب تھیں۔ معلوم ہوا کہ ایک مجلس میں شرکت کرنے گئی ہیں۔ علامہ یہ فی البدیہہ رباعی لکھ کر چھوڑ آئے:

ہیں عالیہ آج کل مجالس کی نقیب
ملتا ہی نہیں پتا کہیں دور و قریب
کل تک تو مجھے ڈر تھا فقط کاظم سے
لو ہو گئے حسین بھی اب اپنے رقیب

ڈاکٹر عالیہ امام کے بارے میں سب سے دلچسپ اور معنی خیز رائے بیگم جوش ملیح آبادی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے جوش صاحب سے گہرے مراسم تھے۔ وہ اکثر ان کے ہاں جاتی تھیں۔ یہ بات بیگم جوش کو پسند نہ تھی۔ ایک روز ان کا پیمانۂ صبر چھلک پڑا۔ آگے کا قصہ ڈاکٹر عالیہ کی زبانی سنیے:

"میری طرف سے پیٹھ پھیر کر جوش صاحب سے مخاطب ہوئیں۔ مجھے ایسی عورتیں زہر لگتی ہیں جو دوسروں کے 'کارخانے' میں دخل دیں"۔ لفظ 'کارخانے' کو اس خوب صورتی سے بیگم جوش ہی استعمال کر سکتی تھیں۔

ڈاکٹر عالیہ امام کی پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے' اس کی تفصیل انھیں کی زبان سے سنیے:
"ہمارے کنبے کی پور پور میں کلاسیکی موسیقی کی انگوٹھیاں جڑی ہوئی تھیں۔ اسی لیے گھر میں ہر پندھرواڑے طبلے پر ٹھوریں مچلتیں' سارنگی کے تار کانپتے' ستار پر جھالا بجتا۔ خورشید فریدی کی پائلیں کھنکتیں' چچا' ماموں' خالہ' پھوپھی سبھی جھوم جھوم کر گل باری کرتے۔ کرشن کنھیا کی مرلی بجتی' امی کو ابا سے زیادہ موسیقی پر عبور تھا۔ موسیقی کے ذریعے کنبے کی لڑکیوں کی تربیت بھی مقصود تھی"۔

یہ تربیت آگے چل کر بہت کام آئی۔ محترمہ کے دولت خانے پر انواع و اقسام کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ ایک ایسی ہی محفل کا دلچسپ حال محترمہ نے ان الفاظ میں قلم بند کیا ہے: "ہمارے گھر پر فیض صاحب کی دعوت ہوئی۔ فیض صاحب سرِشام طلوع ہوئے۔ اس محفل میں مہدی صاحب ساقی گری کے فرائض انجام دے رہے تھے.... اندر جا کر دیکھا تو ہمارے بھائی صاحب (بہنوئی) گھر والوں پر برس رہے تھے.... عالیہ کا گھر اس لائق نہیں رہا کہ کوئی شریف آدمی اس میں قدم رکھے... سید زادی کہلاتی ہیں اور گھر پر جام پر جام ٹکرائے جا رہے ہیں... میں گھبراہٹ کے عالم میں باہر آگئی۔ فیض صاحب مجھے دیکھتے ہی پریشان ہو گئے.... بتاؤ تو سہی آخر کیا ہوا؟... بھائی صاحب گھر چھوڑ کر جا رہے ہیں آپ لوگوں کی وجہ سے' کہتے ہیں پینا قطعاً حرام ہے۔ فیض صاحب بہت ہی سکون کے عالم میں بیٹھے سب کچھ سنتے رہے اور مسکراتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے 'تو کیا ہوا' ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اٹھے۔ بھائی صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ یہ تو عالیہ کی غلطی ہے۔ مجھے پہلے سے بتایا نہیں کہ آپ تشریف لا رہے ہیں۔ ہم تو کسی کی عبادت میں مخل نہیں ہوتے۔ تو پھر آپ کیوں؟ یہ جملہ سنتے ہی بھائی صاحب ہنس پڑے۔ تھوڑی دیر میں دیکھا کہ وہ سب سے آگے بیٹھے ہوئے فیض صاحب کے کلام پر داد دے رہے ہیں"۔

ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنی شادی کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بھی دلچسپی اور عبرت سے خالی نہیں۔ سب سے پہلے ان کی شادی کی بات چیت الہ آباد کے غیور قاسم نامی ایک صاحب

سے چلی۔ یہ صاحب ویسے تو خاصے معقول تھے لیکن پرانی فکر اور فرسودہ روایات میں گندھے ہوئے تھے' اس لیے انھیں مسترد کر دیا گیا۔ پھر کان پور کے ایک وکیل سلطان نیازی امیدوار ہوئے۔ یہ صاحب محترمہ کی سیاسی و سماجی مشغولیات کو جاری رکھنے کے خلاف تھے' لہٰذا انھیں بھی ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تا کہ زندگی سکون سے گزار سکیں۔ پھر کاظم امام صاحب میدان میں آئے۔ بقول ڈاکٹر عالیہ امام: "ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں وقت گزرتا گیا۔ دلچسپیوں کے دائرے وسیع ہوتے گئے۔ پھر صاحب زادے سویڈن چلے گئے۔ میرے گھر والے خوش تھے۔ بات صحیح رخ پر جا رہی تھی کہ اچانک خط آیا۔ مجھے انجینیرنگ کا کورس کرنا ہے' وقت کی کمی ہے' شادی ابھی نہیں کرنا ہے۔ خط ملتے ہی ہم پر اوس پڑ گئی۔ اب تک تو کسی نے بھی اس طرح کی جرأت نہیں کی تھی۔ جس ملک کو چاہا تسخیر کیا اور پھر اُسے مفتوح کے حوالے کر دیا۔ ہماری انا ریزہ ریزہ ہو گئی ..... میں سخت الجھن میں گرفتار ہو گئی .... خطوں کی بارش کر دی۔ ہر خط میں گلاب باڑی لگائی۔ پھول مہکے' خوشبو دور دور تک پھیل گئی... کاظم نے مجھے سویڈن لے جانے کی تیاری مکمل کر لی"۔

کاظم امام صاحب نے نیکی کا یہ کام کیا کہ ڈاکٹر صاحبہ کو سویڈن لے جانے کی بجائے پاکستان لے آئے اور یوں اہلِ پاکستان کو موصوفہ کے علم اور بصیرت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر عالیہ امام نے روس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ ایوب خان اور بھٹو اگر محترمہ کو سفیر بناتے تو یقیناً روس بھیجتے' لیکن زیرِ نظر کتاب پڑھ کر احساس ہوتا ہے جیسے محترمہ پاکستان میں روس کی سفیر ہوں۔

روس سے اُن کی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے کتاب میں اپنے والد مرحوم کی تصویر کے بعد جو تصویر شامل کی ہے' وہ گورباچوف کی ہے۔ کسی آپ بیتی میں مصنف یا مصنفہ کے والد کی تصویر کا شامل کیا جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن کسی اور کے والد (وہ گورباچوف ہی کیوں نہ ہوں) کی تصویر کی شمولیت فہم سے بالا ہے۔ معلوم نہیں جوابی کارروائی کے طور پر گورباچوف نے اپنی سوانح عمری میں محترمہ کی تصویر شامل کی ہے یا نہیں!

(۲۸/۳۱ مئی ۱۹۸۷ء)

کیا ادب پر بھی ٹیکس لگانا چاہیے؟

بھنگ فورم میں ادیبوں کے درمیان گفتگو

شرکائے گفتگو:

ایک مشہور نقاد، ایک معروف محقق

ایک مقبول شاعر، ایک ممتاز افسانہ نگار

بھنگ پینل: ۱۔ منیجر شعبہ اشتہارات ۲۔ فوٹو گرافر ۳۔ پروف ریڈر

بھنگ: سب سے پہلے میں آپ حضرات کو خوش آمدید کہتا ہوں۔

کیا آپ مجھے خوش آمدید نہیں کہیں گے۔ میں بھی تو محفل میں موجود ہوں۔

بھنگ: معاف کیجئے گا محترمہ! غلطی ہوگئی۔ ہاں تو حضرات و خواتین......

ناول نویس: آپ میرے لئے جمع کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہیں۔

نقاد: آپ تو پچاس ناولوں کی مصنفہ ہیں۔ آپ کے لئے جمع الجمع کا صیغہ بھی استعمال کیا جائے تو مناسب ہوگا۔

بھنگ: شرکائے محفل سے گزارش ہے کہ وہ براہِ راست گفتگو نہ کریں، جو کچھ فرمانا ہو، بھنگ پینل کو مخاطب کر کے فرمائیں۔ ہاں، تو پانچ عدد حضرات اور ایک عدد خاتون! میں آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ گزشتہ بارہ گھنٹوں سے اس کمرے میں بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں، حالانکہ جو دعوت نامہ آپ کو بھیجا گیا تھا، اس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ آپ شام سات بجے تشریف لائیں لیکن آپ ازراہِ لطف و کرم صبح سات بجے تشریف لے آئے۔ آپ کے اس لطف و کرم سے ثابت ہوگیا کہ وقت کے ضیاع کا مسئلہ صرف آپ کے قارئین کو درپیش ہی نہیں ہے بلکہ

آپ خود بھی اس معاملے میں خاصے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ ادیب کو فراخ دل ہونا چاہیے کیونکہ اس وصف کے بغیر اعلیٰ ادب تخلیق نہیں ہوسکتا۔ ادارۂ بھنگ.....

نقاد: پہلے یہ تو بتائیے کہ آپ نے اپنے اخبار کا نام "بھنگ" کیوں رکھا ہے؟

بھنگ: جناب عالی! آپ کو سوال کرنے کے لئے نہیں، جواب دینے کے لئے بلایا گیا ہے۔ اگر آپ کو اخبار کے نام کی وجہ بتادی گئی تو آپ دوسرا سوال یہ کریں گے کے اخبار کے ایڈیٹر کا نام مخمور عدم آبادی کیوں ہے؟

نقاد: میں نے آپ کے اخبار کی وجہ تسمیہ اعتراضاً نہیں پوچھی، محض اپنی معلومات میں اضافے کی خاطر سوال کیا ہے۔

بھنگ: یہ کام گزشتہ پچاس برسوں میں نہیں ہو سکا تو اب کیا ہوگا۔ بہرحال آپ کی خواہش کے احترام میں عرض ہے کہ موجودہ دور منشیات کا ہے اور اس وقت دنیا کے تمام ممالک کو منشیات کا خطرہ درپیش ہے۔ اسی خطرے کے سدباب کے لئے ہمارے اخبار کا نام "بھنگ" رکھا گیا ہے۔

نقاد: میرے نزدیک تو اس نام سے منشیات کے رجحان کی حوصلہ افزائی کا پہلو نکلتا ہے۔

بھنگ: اگر آپ اسی طرح گفتگو کے نئے نئے پہلو نکالتے رہے تو ہم موضوع سے ہٹ جائیں گے۔ تنقیدی مقالوں میں تو اس قسم کی بے تکلفی کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر ہمیں محدود وقت کے اندر ایک خاص موضوع پر گفتگو کرنی ہے۔ لیکن اس سے پہلے میں چاہوں گا کہ آپ سے بھنگ پینل کو متعارف کرا دیا جائے۔ میں اخبار کے شعبہ اشتہارات کا سربراہ ہوں۔ میری دائیں طرف ادبی صفحے کے پروف ریڈر بیٹھے ہیں۔ یہ اتنے صاحب نظر ہیں کہ کسی ادیب کی صورت دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ اس کے مسودے میں کس کس لفظ کا املا غلط ہوگا۔

شاعر: آپ انہیں پروف ریڈر کیوں کہتے ہیں۔ قیافہ شناس کہئے۔

بھنگ: میری بائیں طرف فوٹو گرافر ہیں۔ یہ بھی اپنے کام میں ماہر ہیں۔ جیسی کوئی صورت ہوتی ہے ویسی ہی اس کی تصویر کھینچتے ہیں۔

ناول نویس: ان سے کہئے، میری تصویر نہ کھینچیں۔ خدا جانے، فوٹو گرافروں کو مجھ سے کیا دشمنی ہے کہ میری تصویر کبھی ایسی نہیں کھینچتے جسے دیکھ کر میرے علاوہ بھی کوئی خوش ہو۔ میں اپنی ایک تصویر لے کر آئی ہوں اور آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔ اخبار میں یہی چھاپی جائے۔

بھنگ: بہت عمدہ تصویر ہے، مگر یہ تو کم از کم ۲۵ سال پہلے کی ہے۔
ناول نویس: ۲۵ سال پہلے کی تو نہیں، ہاں ۲۴ سال پہلے کی ضرور ہے۔
بھنگ: مگر ہم تازہ تصویر چھاپیں گے۔ باسی خبریں اور باسی تصویریں ہمارے اخبار میں نہیں چھپتیں۔
شاعر: اگر مجھے پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہاں تصویریں کھینچی جائیں گی تو میں منہ دھو کر آتا۔
فوٹوگرافر: آپ پریشان نہ ہوں۔ چھاپنے سے پہلے تصویر کا منہ دھولیا جائے گا۔
شاعر: بے حد شکریہ۔ آپ نے مجھے بے جا زحمت سے بچالیا۔
افسانہ نگار: فوٹوگرافر صاحب! اس کا خیال رکھئے گا کہ فلیش کی تیز روشنی میں میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔
فوٹوگرافر: کوئی بات نہیں، تصویر دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھل جائیں گی بلکہ کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔
بھنگ: بڑی خوشی کی بات ہے کہ اب تک ہم نے بڑی فکر انگیز گفتگو کی مگر اب ہمیں اپنے اصل موضوع پر بھی اظہار خیال کرنا چاہئے۔
نقاد: یہ تو بتا دیجئے کہ آج کی گفتگو کا موضوع کیا ہے؟
بھنگ: خدا جانے وہ کاغذ کہاں چلا گیا، جس پر موضوع لکھا تھا اور ایڈیٹر صاحب نے کچھ جملے بھی لکھ کر دیئے تھے جنہیں یہاں بطور ابتدائی کلمات گوش گزار کرنا تھا۔ محترمہ ناول نویس صاحبہ! میں نے آپ کی تصویر واپس کرتے ہوئے اس کے ساتھ کوئی کاغذ تو آپ کو نہیں دے دیا تھا۔
ناول نویس: آپ نے تصویر مجھے واپس نہیں کی۔ وہ آپ نے اپنی جیب میں رکھ لی تھی۔ ہاں ایک کاغذ مجھے دیا تھا جسے یہ سمجھ کر میں نے پرس میں رکھ لیا تھا کہ کوئی خط ہوگا، جسے گھر جا کر پڑھوں گی۔ لیجئے، آپ کا کاغذ یہ ہے۔
بھنگ: یہی تو وہ کاغذ ہے، جس کی مجھے تلاش تھی۔ ہاں تو آج کا موضوع گفتگو یہ ہے کہ کیا ادب پر بھی ٹیکس لگانا چاہئے؟ اس موضوع پر گفتگو کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہماری عوامی حکومت نے زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے متعلق تمام چیزوں پر ٹیکس لگا دیا ہے یا بڑھا دیا ہے۔ ایک آزادیٔ تحریر باقی رہ گئی تھی، سو اسے بھی نشانے پر رکھ لیا ہے۔ کاغذ اور چھپائی کے سامان کے ساتھ ساتھ کتابیں، رسالے اور اخبارات بھی ٹیکس کی زد میں آ گئے ہیں۔ اہلِ نظر کی رائے یہ ہے کہ

حکومت اس وقت تک آزادیٔ تحریر پر پوری طرح قابو نہیں پا سکتی، جب تک ادب پر ٹیکس نہ لگایا جائے کہ تمام خرابیوں کا سرچشمہ یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب لکھنے والوں کو اپنی ہر تحریر پر ٹیکس ادا کرنا پڑے گا تو وہ لکھنے کی بجائے کوئی شریفانہ شغل اختیار کریں گے۔

نقاد: میری رائے میں صرف تخلیقی ادب پر ٹیکس لگنا چاہئے۔ تنقید پر نہیں کیونکہ تنقید ایک اصلاحی کام ہے اور جو کام معاشرے کے کسی شعبے کی اصلاح کے لئے کئے جائیں، ان پر ٹیکس لگانے سے معاشرے کی اصلاح کا کام متاثر ہوگا۔

سفرنامہ نگار: سفرناموں کی شمار بھی تخلیقی ادب میں نہیں ہوتا کیونکہ ہم لوگ تو دوسرے ملکوں کے معلوماتی کتابچوں کو اردو میں منتقل کرتے ہیں۔

افسانہ نگار: تخلیقی ادب پر اگر ٹیکس لگانا ہے تو صرف شاعری پر ٹیکس لگانا چاہئے۔ کیونکہ کہ بے کار کام ہمارے ہاں بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ ایک شاعر دن میں دس دس غزلیں لکھتا ہے جو کسی کام کی نہیں ہوتیں۔ ایسے بے مقصد شغل کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے تا کہ روایاتِ ادب میں اضافہ نہ ہو سکے۔

شاعر: روایاتِ ادب میں اضافہ تو افسانوں کی صورت میں بھی ہو رہا ہے۔

بھنگ: آپ لوگوں نے تو ذاتی لڑائی شروع کر دی۔ ہمیں اصولی باتوں تک اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہئے۔ از راہِ کرم آپ ایک دوسرے سے براہ راست گفتگو نہ کریں۔ صرف بھنگ چینل کے سوالوں کا جواب دیں۔ میں سب سے پہلے جناب نقاد سے پوچھنا چاہوں گا کہ ادب پر ٹیکس لگنا چاہئے یا نہیں۔

نقاد: ٹیکس ہی نہیں لگنا چاہئے، بلکہ خراب تحریروں پر جرمانے بھی ہونے چاہئیں، میں تو یہاں تک کہوں گا کہ تخلیقِ ادب کو قابلِ دست اندازیٔ پولیس ہونا چاہئے۔

بھنگ: کیا آپ کی مراد یہ ہے کہ پولیس کی دسترس ادب تک ہونی چاہئے۔ یعنی پولیس والوں کو بھی ادب پڑھنا چاہئے۔

نقاد: ہرگز نہیں۔ ہماری پولیس کم تنخواہ ملنے کی وجہ سے پہلے ہی ناگفتہ بہ حالات کا شکار ہے۔ ادب پڑھ کر تو وہ پولیس مقابلوں کے بھی لائق نہیں رہے گی۔ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ خراب ادب لکھنے والوں کا چالان کر کے عدالت سے

انہیں سزا دلوائیے۔
سفرنامہ نگار: اس قسم کے معاملات کو پولیس پر نہیں چھوڑنا چاہئے کیونکہ پولیس، مجرموں سے ساز باز کر کے بے گناہوں کو سزا دلوا دیتی ہے۔
محقق: سفرنامے لکھنے والے تو واقعی بے گناہ ہوتے ہیں کہ سفر کا گناہ کئے بغیر سفرنامے لکھ ڈالتے ہیں۔
بھنگ: خدا کا شکر ہے کہ آپ نے بھی اپنی زبان مبارک کو زحمت دی۔ اب جب کہ یہ ثابت ہو گیا کہ آپ بول بھی سکتے ہیں تو یہ فرمائیے کہ ادب پر ٹیکس لگانے کے سلسلے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟
محقق: میری رائے ہے کہ سوائے تحقیقی کاموں کے باقی ہر قسم کی تحریروں پر ٹیکس لگنا چاہئے۔
بھنگ: یہ عجیب بات ہے کہ ہر ادیب صرف اس صنفِ ادب پر ٹیکس لگانے کا حامی ہے جس سے اس کا اپنا کوئی تعلق نہیں۔ محقق صاحب! یہ بتائیے کہ آپ کے کام پر ٹیکس کیوں نہ لگایا جائے؟
محقق: اس لئے کہ ہم لوگ ادیب نہیں ہیں۔ ہم تو ادیبوں کی پیدائش اور موت کا حساب رکھتے ہیں۔ اسی میں زندگی بسر کر دیتے ہیں کہ کون کب پیدا ہوا اور کب مرا۔
بھنگ: اس سے آپ کو کوئی فائدہ تو ہو گا۔ اور جس کام سے فائدہ ہو اس پر ٹیکس تو لگنا چاہئے۔
محقق: اس کام سے ہمیں تو کیا فائدہ ہو گا، ادیب ہی فائدے میں رہتے ہیں کہ ہماری متعین کردہ تاریخوں کے مطابق ان کے یوم پیدائش اور یوم وفات منائے جاتے ہیں۔
بھنگ: آپ تخلیقی ادب پر ٹیکس لگانے کے حامی کیوں ہیں؟
محقق: ادیب اس کثرت سے پیدا ہونے لگے ہیں کہ اس سے مستقبل کے محققوں کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ تخلیقات پر ٹیکس لگانے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ادیبوں کی تعداد خود بخود کم ہو جائے گی، بلکہ میں تو یہ تجویز پیش کروں گا کہ جس طرح کار چلانے اور گدھا گاڑی چلانے کے لئے مقررہ فیس ادا کر کے لائسنس حاصل کیا جاتا ہے، اسی طرح قلم چلانے کے لئے بھی لائسنس حاصل کرنے کا قانون نافذ کر دیا جائے۔ اس میں حکومت کا بھی فائدہ ہے اور ادب کا بھی۔ حکومت کو لائسنس فیس کے ذریعے خطیر رقم ملے گی اور ادب کو ان لوگوں سے نجات مل جائے گی جنہیں قلم چلانا نہیں آتا مگر چلائے جاتے ہیں۔
افسانہ نگار: مجھے اس تجویز سے سخت اختلاف ہے کہ ادیبوں پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ یہ ٹیکس

ڈرائیوروں اور کوچوانوں کی طرح لائسنس حاصل کریں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ حکومت شادی بیاہ اور بچوں کی پیدائش پر ٹیکس عائد کر دے تا کہ بچے کم پیدا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب بچے کم پیدا ہوں گے تو اسی نسبت سے ادیب بھی کم پیدا ہوں گے۔

بھنگ: میرے خیال میں یہ تجویز بہت عمدہ ہے اور اسی پر ہمیں یہ گفتگو ختم کر دینی چاہئے۔

عریانی اور فحاشی ایک متنازع مسئلہ ہے

سوال: آپ کے خیال میں ایک اچھے اور کامیاب صحافی میں بنیادی طور پر کن خوبیوں کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: ...... خوبیاں جو میرے والد محترم میں ہیں۔ اس طرح کی خوبیوں اگر کسی صحافی میں ہوں، تو میں اسے کامیاب صحافی کہوں گا۔

سوال: آپ کے والد محترم میں ایک صحافی کی حیثیت سے جو خوبیاں ہیں، ان کی کچھ وضاحت کر دیجیے۔

جواب: میرے والد صاحب سب کے سامنے ہیں، ان کی خوبیوں کا سب کو علم ہے۔

سوال: ضروری نہیں ایک شخص جو آپ کا یہ انٹرویو پڑھے، وہ آپ کے والد صاحب کی خوبیوں سے آگاہ ہو۔ اس لیے آپ اپنی بات کی کچھ تو وضاحت کریں۔

جوب: کچھ باتیں صرف محسوس کی جا سکتی ہیں، انھیں بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

سوال: آپ اپنے محسوسات کو اگر پوری طرح بیان نہیں کر سکتے، تو جس حد تک ممکن ہو اس حد تک تو آپ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کریں۔

جواب: میں نے ایک اچھے صحافی کی خوبیوں کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ دیا ہے۔

یہ مکالمات کسی مزاحیہ ڈرامے کے نہیں ہیں اور نہ یہ کسی فرضی انٹرویو کے اقتباسات ہیں۔ یہ حقیقی ایک "گفتگو کا حصہ ہیں۔ سوال صحافی محمد آصف بھلی کے ہیں اور جواب میر شکیل الرحمن کے، جو روزنامہ "جنگ" لاہور کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ اگر یہ انٹرویو "ندا" لاہور جیسے موقر جریدے

میں شائع نہ ہوتا تو ہم یہی سمجھتے کہ کسی نے میر شکیل الرحمٰن کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹے میر صاحب نے اپنی نیک نامی کے لیے خود ہی راہ ہموار کی ہے۔ اگر موصوف ایک اچھے اور کامیاب صحافی کی خوبیاں بیان فرما دیتے، تو دنیائے صحافت کا ایک اہم راز فاش ہو جاتا۔ سرکاری رازوں کی طرح بعض غیر سرکاری رازوں کا فاش ہو جانا بھی مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔ میر شکیل الرحمٰن نے جس احتیاط سے کام لیا ہے، اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ خود بھی ایک اچھے اور کامیاب صحافی ہیں۔

مذکورہ مکالمات سے انٹرویو کا آغاز ہوتا ہے۔ اصولاً ان مکالمات پر ہی انٹرویو کو ختم ہو جانا چاہیے تھا، کیونکہ آگے گفتگو کی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ صحافی ہی کیا جو خاموش ہو جائے۔ بھٹی صاحب نے سوال کیا، ''ایک اچھے اخبار کے محاسن آپ کے نزدیک کیا ہیں؟'' جواب ملا، ''جس طرح کہ ہمارا یہ اخبار ''جنگ'' ہے، اس طرح کی خوبیاں اگر کسی اخبار میں ہوں گی تو میرے نزدیک وہ اچھا اخبار ہوگا۔'' سبحان اللہ! اگلے زمانے میں شاعر سہلِ ممتنع میں شعر کہا کرتے تھے، اب اخبار کے چیف ایڈیٹر بھی اس شعری صفت میں رواں ہو گئے ہیں۔ چھوٹے میر صاحب نے ایک اچھے اخبار کا جو معیار متعین فرمایا ہے، وہ بلاشبہ مثالی ہے۔ کیونکہ سوائے ایک اخبار کے کوئی دوسرا اخبار اس معیار تک نہیں پہنچ سکتا اور اگر کوئی اس معیار تک پہنچنے کی کوشش کرے گا، تو اسے خود اپنے معیار سے نیچے اتر آنا پڑے گا۔

سلسلۂ گفتگو آگے بڑھا تو بھٹی صاحب نے کہا، جنگ میں باوثوق ذرائع سے جو خبریں شائع ہوتی ہیں، ان میں سے بعض خبروں کو چھوڑ کر زیادہ تر خبریں بعد میں غلط ثابت ہوتی ہیں۔ اس طرح اخبار کی ساکھ متاثر ہوتی ہے۔ چیف ایڈیٹر صاحب نے بے ساختہ فرمایا، ''ہمارے اخبار ہی کی ساکھ متاثر ہوتی ہے، اس سے آپ کو تو نقصان نہیں پہنچتا۔'' جواب بالکل درست ہے۔ اخبار میر صاحبان کا ہے۔ وہ جھوٹی خبریں چھاپیں یا سچی یا سرے سے خبریں ہی نہ چھاپیں، صرف اشتہاروں یا مزاحیہ کالموں پر گزارا کریں، اس سے کسی کو کیا۔ ساکھ بنے یا بگڑے مالکان کا ذاتی معاملہ ہے، ذاتی معاملات میں غیروں کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ایسا مسکت جواب سننے کے بعد اصولاً بھٹی صاحب کو اپنے سوال پر معذرت کرنی چاہیے تھی، لیکن انھوں نے ہر طرح کے اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا، ''مجھے نقصان کیوں نہیں پہنچتا۔ جب مجھے اخبار میں

پڑھنے کے لیے جھوٹی اور بے بنیاد خبریں ملیں گی، تو اس سے مجھے فائدہ تو نہیں پہنچے گا، نقصان ہی ہو گا۔'' اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ آپ اخبار پڑھتے ہی کیوں ہیں، ٹی وی کا خبر نامہ دیکھا کیجیے، تاکہ سچ اور جھوٹ کی تمیز جاتی رہے۔ جس ملک میں آدمی پیدا ہوتے ہی اخباروں کے چیف ایڈیٹر بن جائیں، وہاں اخباروں میں سچی خبریں تلاش کرنا، نثری نظم میں محاسن ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔

دوران گفتگو چھوٹے میر صاحب کو بتایا گیا، بعض حلقوں کا خیال ہے کہ ان کا اخبار عریانی اور فحاشی پھیلاتا ہے۔ انھوں نے فرمایا، ''جو چیزیں ہم بڑی احتیاط اور چھان بین کے بعد شائع کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو ان میں عریانیت نظر آتی ہو، لیکن قارئین کی اکثریت کو ہم پر اعتماد ہے.... اگر آپ ہمیں عریانی اور فحاشی پھیلانے کا الزام دے رہے ہیں، تو پھر عوام کو بھی مورد الزام ٹھہرائیں کہ وہ بھی فحاشی چاہتے ہیں۔''

دراصل بات یہ ہے کہ عریانی اور فحاشی ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ ایک چیز جو سوال کرنے والے کو فحش نظر آتی ہے، ضروری نہیں کہ وہ جواب دینے والے کے نزدیک بھی فحش ہو۔ جس طرح سیاسی مسائل میں بھی اختلاف رائے ہوتا ہے، اسی طرح عریانی اور فحاشی کے معاملے میں بھی ہر شخص کی سوچ مختلف ہوتی ہے۔ سوچ کے ساتھ یہ معاملہ نظر کا بھی ہے۔ میر شکیل الرحمٰن صاحب فکر مند ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب نظر بھی ہیں، انھیں معلوم ہے کہ فحاشی کیا چیز ہے اور کہاں نظر آسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز انہیں اپنے اخبار میں نظر نہیں آئے گی۔ ہاں دوسرے اخباروں میں وہ اسے بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی لیے تو انھوں نے مزید یہ فرمایا ہے، ''آپ نے جنگ ہی کو عریانی اور فحاشی پھیلانے کا ذمہ دار کیوں ٹھہرا دیا ہے۔ آپ نوائے وقت کے مالکان سے بھی یہ سوال پوچھیں کہ عریانی اور فحاشی پھیلانے میں ان کا کیا کردار رہا ہے، وہ بھی تو نوائے وقت میں بلا وجہ اور بلا جواز خواتین کی تصاویر بڑے نمایاں انداز میں شائع کررہے ہیں۔ کیا آپ لوگوں کو نوائے وقت میں عریانی اور فحاشی نظر نہیں آتی۔ آپ نوائے وقت اور جنگ کے مندرجات اور تصاویر کا تقابلی جائزہ لیں، تو آپ میری بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ فحاشی ہم نہیں بلکہ نوائے وقت پھیلا رہا ہے۔''

میر صاحب نے جو کچھ فرمایا اس کا ملخّص یہ ہے کہ ان کے اخبار میں عریانی اور فحاشی بلا وجہ

اور بلا جواز نہیں ہے، چونکہ عوام ایسا چاہتے ہے اس لیے ان کی خواہش کا احترام کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس نوائے وقت کی عریانی اور فحاشی بلا وجہ اور بلا جواز ہے، جس کے ذمہ دار اس اخبار کے مالکان ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ چھوٹے میر صاحب نے اپنے اخبار کے اداریوں کے برعکس صاف گوئی سے کام لے کر ایک بہت اہم مسئلے کو طے کر دیا۔ آئندہ عریانی اور فحاشی کی تعریف یہ ہوگی کہ یہ وہ چیز ہے، جو نوائے وقت کے صفحوں پر بے نقاب نظر آتی ہے، لیکن جنگ کے صفحات پر شائستگی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ عریانی و فحاشی کے ذریعے نوائے وقت لوگوں کا اخلاق خراب کرتا ہے، جنگ انھیں اخلاق اور شائستگی کی تعلیم دیتا ہے۔

چھوٹے میر صاحب نے اچھا کیا کہ یہ بھی بتا دیا کہ عریانی و فحاشی پھیلانے کے اصل ذمہ دار عوام ہیں۔ چونکہ عوام فحش تحریریں پڑھنے اور عریاں تصاویر دیکھنے کے خواہش مند ہیں، اس لیے جنگ اس ضمن میں عوام کی خدمت کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ غلطی سے اخبار میں کچھ غیر فحش چیزیں بھی چھپ جاتی ہیں۔ یقیناً اس سے عوام کی دل آزاری ہوتی ہوگی، لیکن عوام کو بھی سوچنا چاہیے کہ اخبار والے بھی آخر انہیں کی طرح انسان ہیں، اگر ان سے غلطی ہو جائے تو اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔

بھلی صاحب نے ایک سوال یہ بھی کیا: ''ایک اہم اخبار کے ایڈیٹر کا یہ مؤقف ہے کہ جنگ کی کوئی پالیسی نہیں ہے اور جنگ ایک مادر پدر آزاد اخبار ہے۔ اس الزام کا آپ کیا جواب دیں گے۔'' ہمارے خیال میں اس قسم کے سوال اٹھانا صحافی اخلاق کے منافی ہے۔ اوّل تو جنگ پر بڑے میر صاحب کا پورا پورا کنٹرول ہے، اس لیے اسے مادر پدر آزاد اخبار کہنا غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ پالیسی کوئی ریڈی میڈ لباس نہیں ہے، جو بازار سے خریدا اور پہن لیا۔ یہ تو بنتے بنتے بنتی ہے اور عام طور پر بننے ہی کے مرحلے میں رہتی ہے۔ پالیسی ایک مرتبہ بن جائے، تو اس کے بگڑنے یعنی تبدیل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، لیکن جس چیز کا وجود ہی نہ ہو، اس کے بگڑنے یا تبدیل ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ کسی پالیسی کا نہ ہونا بھی ایک پالیسی ہے اور دانش مندوں کے نزدیک یہی سب سے بہتر پالیسی ہے۔

ایک اچھے اخبار کی پالیسی ہمیشہ حکومتِ وقت کی پالیسی کے تحت ہوتی ہے، اشتہار لیتے رہنے اور حکومت کی تائید میں خبریں چھاپتے رہنے ہی میں عافیت ہے۔ ہاں اگر کچھ لوگ کلاشنکوف

وغیرہ لے کر آجائیں، تو ان کی مرضی کی خبریں چھاپنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک اچھا ایڈیٹر جس طرح عوام کے جذبات کا خیال رکھتا ہے، اسی طرح اسے کلاشنکوف کے جذبات بلکہ عملی اقدامات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

معاف کیجیے بھلّی صاحب کے سوال کا جواب ہم نے اپنی طرف سے دے دیا اور یہ نہیں بتایا کہ جن صاحب سے یہ سوال کیا گیا تھا، انھوں نے کیا فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں، ''عوام جنگ کو ایسا اخبار خیال کرتے ہیں جو قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اگر ہماری کوئی پالیسی نہ ہو، تو ہم عوام کی رہنمائی کا فرض کیوں کر ادا کر سکتے ہیں؟'' چیف ایڈیٹر صاحب نے بہت اچھا کیا، یہ بتا دیا کہ ان کا اخبار قوم کی رہنمائی کر رہا ہے۔ شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ اخبار کی ترقی ہو رہی ہے اور قوم رو بہ زوال ہے، لیکن ہم قوم کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ جنگ میں ''تین مرد تین کہانیاں'' کا پرجوش اور ولولہ انگیز ہفتہ وار سلسلہ شروع ہو چکا ہے، جسے پڑھ کر جلد ہی قوم اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے گی۔

بھلّی صاحب نے ایک دلچسپ سوال یہ کیا، ''صحافت میں آنے کے بعد کیا کھویا اور کیا پایا؟'' چیف ایڈیٹر صاحب نے جواب دیا، ''چین، سکون اور آرام کھویا، عزت، دولت، شہرت یہ تمام نعمتیں مجھے صحافت کی وجہ سے میسر آئیں۔'' اس جواب کا پہلا حصہ مبہم ہے۔ واضح طور پر بتانا چاہیے تھا کہ کس کا چین، سکون اور آرام غارت ہوا۔ جواب کے دوسرے حصے میں ''عزت'' کا لفظ دولت اور شہرت کے قافیے کے اعتبار سے تو ٹھیک ہے، لیکن معنی کے اعتبار سے بے محل معلوم ہوتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ خوش مزاج اور معاملہ فہم کاتب نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہو؟

اور اب آخر میں انٹرویو کا سب سے اہم سوال اور اس کا جواب بھی ملاحظہ فرمایئے۔

سوال۔ کیا آپ کا ضمیر اس اعتبار سے مطمئن ہے کہ ایک صحافی کی حیثیت سے آپ پر جو قومی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں، آپ نے ہمیشہ انھیں پوری دیانت داری سے ادا کیا ہے؟

جواب۔ نہیں میرا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اپنی صحافتی ذمہ داریوں کو ہمیشہ پوری دیانت داری سے ادا نہیں کر پایا۔

ہم اس سوال اور اس کے جواب پر تبصرہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، کیونکہ ہمیں ''ضمیر'' اور ''دیانت داری'' کے معنی معلوم نہیں ہیں۔ ان لفظوں کے معنی جاننے کے لیے ہم نے صحافت کی لغت

دیکھی، تو معلوم ہوا، یہ دونوں الفاظ لغت میں موجود ہی نہیں۔

دشتِ ادب کی سیّاحی یا سیاہی

مظہر امام ہندوستان کے اُن نامی گرامی ادیبوں میں سے ہیں جو بیک وقت شاعر اور نقاد ہونے کے باوجود خاصے پڑھے لکھے ہیں لیکن منکسر المزاج اتنے ہیں کہ اپنی تحریروں سے اپنا علم کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انھیں معلوم ہے، یہ زمانہ علم کی قدر کا نہیں ہے لہٰذا بے بصارت لوگوں کے درمیان لعل و گوہر کی نمایش بے فائدہ ہے۔ نمود و نمایش کو ویسے بھی وہ پسند نہیں کرتے، یہاں تک کہ اپنی غزلوں کے مقطعوں میں تخلص کے استعمال سے بھی اجتناب کرتے ہیں اور اگر تخلص استعمال کرنا ہی پڑے تو ''امام'' کو لغوی معنوں میں باندھتے ہیں۔ مثلاً اُن کا ایک مقطع ہے:

جہاں امام کے اعزاز میں ہے جلسۂ عام
وہاں سے کوئے ملامت بھی کوئی دور نہیں

یہاں لفظ ''امام'' سے مراد کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے لیکن مظہر امام نہیں ہو سکتے، کیوں کہ اُن کے اعزاز میں کبھی کوئی جلسۂ عام نہیں ہوا۔ اُن کی ادبی خدمات کا اعتراف جلسۂ عام کے ذریعے ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کے لیے تو باقاعدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کی تین یونی ورسٹیوں (رانچی، بہار اور متھلا) میں اُن پر تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں اور کئی یونی ورسٹیوں میں لکھے جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اتنی بہت سی یونی ورسٹیوں میں ایک ہی موضوع پر تحقیق سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہندوستان میں موضوعاتِ تحقیق کا قحط ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مظہر امام اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر محققوں میں بے حد مقبول ہیں اور ہر اعتبار سے اس لائق ہیں کہ اُن پر تحقیق کی جائے اور بار بار کی جائے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں زندہ لوگوں پر تحقیق ہوتی ہے جو آدابِ تحقیق کے منافی ہے۔ تحقیق صرف اُن پر ہونی چاہیے جو ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ مرحومین پر تحقیق کرنا بہت مشکل ہے کیوں کہ کوئی مرحوم ادیب کسی محقق کو اپنے بارے میں معلومات فراہم نہیں کر سکتا جب کہ زندہ ادیب ہر ممکن مدد کر سکتا ہے، یہاں تک کہ محقق کی نااہلی کو دیکھتے ہوئے تحقیقی مقالہ بھی لکھ کر دے سکتا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تحقیق مرحومین پر ہونی چاہیے نہ زندہ ادیبوں پر بلکہ صرف زندۂ جاوید ادیبوں کو تحقیق کا موضوع بنانا چاہیے۔ ہمیں اس سے بھی اتفاق نہیں ہے کیوں کہ اِس اصول پر عمل کے نتیجے میں ہر زندہ ادیب اپنے آپ کو زندۂ جاوید سمجھنے لگے گا۔ ادب کی گردن پر زندہ ادیبوں ہی کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہے، اگر زندۂ جاوید ادیبوں نے بھی اسی شاخِ نازک پر آشیانہ بنالیا تو صورتِ حال خاصی تشویش ناک ہو جائے گی۔

معاف کیجیے، بات ہو رہی تھی مظہر امام کی اور بیچ میں آگئے زندۂ جاوید ادیب، حالاں کہ مظہر امام کا اِس قماش کے ادیبوں سے کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ وہ ادب میں گروہ بندی کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کے نزدیک ادیب صرف ادیب ہوتا ہے، زندۂ جاوید یا مردہ بدست زندہ نہیں ہوتا۔

مظہر امام نے مختلف جہتوں میں ادب کی خدمت کی ہے، لیکن اُن کا سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ وہ ایک نئی صنفِ ادب ''آزاد غزل'' کے بانی ہیں۔ صنفِ نازک کی طرح اس صنف میں بھی بڑی لچک پائی جاتی ہے۔ اس کے ہر شعر کا پہلا مصرع دوسرے مصرعے سے لمبائی میں کم یا زیادہ ہوتا ہے، دونوں مصرعے برابر اِس لیے نہیں ہوتے کہ کہیں شعر بامعنی نہ ہو جائے۔

ہم نے مظہر امام کا مفصل تعارف اس لیے کرا دیا ہے کہ وہ ہندوستان میں تو ظہوری ہیں لیکن پاکستان میں بڑی حد تک خفائی ہیں۔ وہ اُن ہندوستانی ادیبوں میں سے نہیں ہیں جو مشاعروں اور انجمن سادات امروہہ کے سالانہ جلسوں کی رونق بڑھانے کے لیے آتے ہیں اور جن کے ناموں سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہے (اور بالآخر بچے ہی واقف رہ جائیں گے)۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے مظہر امام صرف ایک ہی دفعہ پاکستان آئے ہیں؛ چند برس پہلے وہ کراچی تشریف لائے تھے تو اُس وقت ہنگاموں کی وجہ سے یہاں کرفیو نافذ تھا۔ اُن کے اعزاز میں کوئی تقریب نہ ہو سکی، وہ چپکے سے آئے اور چپکے سے چلے گئے۔ اگر دو چار جلسے ہو جاتے تو ہمیں یہ تعارفی سطور نہ لکھنی پڑتیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مظہر امام کی کراچی میں آمد کے موقع پر کرفیو نافذ ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ اُن کے اعزاز میں کوئی جلسہ نہ ہو سکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

آمدم برسرِ مطلب ... چند روز ہوئے مظہر امام کی تازہ تصنیف ''اکثر یاد آتے ہیں'' پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے جس میں جگر مراد آبادی، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، کرشن چندر، خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے مشہور اور اشک امرتسری اور اختر قادری جیسے نسبتاً کم معروف ادیبوں کا تذکرہ ہے۔ جمیل مظہری، پرویز شاہدی اور اختر قادری کو مصنف نے قریب سے دیکھا ہے۔ اس لیے اُن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اُسے خاکہ نویسی کا بہت اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے، مگر باقی مضامین طرح پر کہی گئی غیر طرحی غزلوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ یعنی عنوان تو بنایا ہے کسی شخصیت کو مگر جو کچھ لکھا ہے، اُس کا اُس شخصیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اِدھر اُدھر کی دلچسپ باتوں کے ساتھ عنوان کے حوالے سے بھی دو چار باتیں لکھ دی گئی ہیں۔ بعض مضامین کو پڑھ کر کسی ایسے مکان کا خیال آتا ہے جس کے دروازے پر تختی تو کسی اور کے نام کی ہو لیکن رہتا کوئی اور ہو۔ دوسروں کے ناموں کی تختیوں والے مکانوں میں ایک ہی مکین نظر آتا ہے اور وہ خود اِس کتاب کا مصنف ہے۔

مظہر امام نے اس کتاب میں جتنا کچھ اپنے بارے میں لکھا ہے، اتنا اُن کے بارے میں نہیں لکھا جو اُنھیں اکثر یاد آتے ہیں۔ اگر اس کتاب میں شامل تمام مضامین کو شخصی خاکے تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مظہر امام نے آٹھ ادیبوں پر نہیں لکھا بلکہ اِن آٹھ ادیبوں نے مظہر امام پر مضامین لکھے ہیں۔ جگر مراد آبادی اور مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ بہت اچھے خاکہ نویس تھے۔ اُنھوں نے مظہر امام کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جو کسی دوسرے کو معلوم نہیں تھے۔

جو لوگ اس کتاب کو شخصی خاکوں کا مجموعہ سمجھ کر پڑھیں گے، ممکن ہے اُنھیں قدرے مایوسی ہو لیکن مظہر امام کی آپ بیتی سمجھ کر پڑھنے والوں کے لیے اس کتاب میں دلچسپی کا خاصا سامان موجود ہے۔ دیباچہ نگار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے بقول مظہر امام نے اپنی پوری زندگی ادبی دشت کی سیاحی میں گزاری ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر نارنگ کے ذہن میں یہ بات ہو کہ مظہر امام نے بڑے سلیقے سے اپنی زندگی ضائع کی ہے، مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ اُنھوں نے بہار اور کلکتے کی ادبی زندگی اور وہاں کے ادیبوں کے بارے میں اپنی یادداشتیں قلم بند کر کے ادب کے مورخ کے لیے خام مواد فراہم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لفظ ''خام'' کے استعمال سے کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، اس کا ''خامی'' سے کوئی جائز یا ناجائز تعلق نہیں۔ اس لفظ کے

ایک معنی خالص اور کھرے کے بھی ہیں اور ہم نے یہ لفظ اُنھی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

مظہر امام نے اس کتاب میں اپنے بارے میں بڑی نادر معلومات پیش کی ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ اُن کی شاعری کا آغاز اس طرح ہوا کہ ایک رسالے میں یگانہ اور عزیز لکھنوی کی ہم طرح غزلیں چھپی تھیں، اُن میں سے بہترین اشعار لے کر انھوں نے ایک غزل ''بنائی'' اور اپنے نام سے چھپوا دی۔ ادبی ذوق کی آبیاری کی صورت یہ پیدا ہوئی کہ اُن کے ماموں محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے، دوسروں کے نام جو ادبی رسالے آتے تھے، وہ پڑھنے کے لیے بھانجے کو مل جاتے تھے۔ ادبی خود اعتمادی اس طرح پیدا ہوئی کہ ایک رسالے میں اُن کی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظمیں آگے پیچھے چھپی تھیں۔ جس شخص کی ادبی نشوونما میں یگانہ، عزیز لکھنوی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور محکمۂ ڈاک نے حصہ لیا ہو، اُس کے ادبی مستقبل کے روشن ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہوسکتا۔

کلکتے کی ادبی زندگی میں مظہر امام کو بقولِ خود پبلک ریلیشنگ آفیسر کی حیثیت حاصل تھی۔ انھیں شاعروں، ادیبوں سے ملنے، انھیں آپس میں ملانے اور مشاعروں میں شرکت کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ زیرِ نظر کتاب میں بے شمار مشاعروں کا تذکرہ ہے۔ جن میں مظہر امام صاحب نے شرکت کی۔ جگر مرادآبادی کے بارے میں سنا ہے کہ وہ مشاعروں میں شرکت کے لیے مہینوں سفر میں رہتے تھے۔ مظہر امام ہر وقت حالتِ سفر میں نظر آتے ہیں۔ وہ ایسے موقعوں پر بھی مشاعروں کے انعقاد کی گنجایش پیدا کر لیتے تھے، جہاں عموماً غیر سنجیدہ اعمال سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ مثلاً پرویز شاہدی کی شادی ہوئی تو مظہر امام نے براتیوں کے اجتماع کو مشاعرے میں تبدیل کردیا۔ کئی شاعروں نے تہنیتی نظمیں پڑھیں، خود مظہر امام نے جو نظم پڑھی، اُسے کاغذی رومال پر چھپوا کر تقسیم بھی کیا گیا۔ علامہ جمیل مظہری کا بیان ہے کہ نظم خود دولھا میاں نے مظہر امام کو لکھ کر دی تھی۔ موصوف نے اگرچہ اس بیان کی تردید کی ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ جو شخص یگانہ اور عزیز لکھنوی سے غزل لکھوا سکتا ہے، اُس کے لیے پرویز شاہدی سے نظم لکھوا لینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

شادی کا ذکر چلا ہے تو یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ مظہر امام نے خود اپنی شادی پر بہت سے شاعروں سے تہنیتی نظمیں لکھوائیں اور اُن کا مجموعہ ''شاخِ حنا'' کے نام سے شائع کیا۔ ''براتِ عاشقاں بر شاخِ آہو'' تو سنا تھا لیکن ''شاخِ حنا'' کی ترکیب پہلی مرتبہ سننے میں آئی۔ شادی کی رعایت سے بہت عمدہ ترکیب ہے۔ اگر ہمیں اس کتاب کی اشاعت کا علم ہوتا تو ہم بھی تہنیتی نظم لکھ بھیجتے۔ اب تو اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن ہی میں ہماری نظم شامل

ہو سکتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مظہر امام ادیبوں کے بے مثال خدمت گزار ہیں۔ جوشؔ کلکتے آئے تو پرویز شاہدی نے اُن کے اعزاز میں جام و مینا کی محفل سجائی۔ مظہر امام نے اس میں ساقی گری کے فرائض انجام دیے۔ پرویز شاہدی اُن سے نامہ بری کا کام بھی لیتے تھے، اپنی محبوبہ کو اُنھی کے ہاتھ خط بھجواتے تھے، مگر جب ایک مرتبہ محبوبہ نے مظہر امام کی خوش وضعی کی تعریف کی تو پرویز شاہدی نے احتیاطاً اُنھیں نامہ بری کے عہدے سے برطرف کردیا۔ کرشن چندر کلکتے آکر بیمار پڑ گئے تو موصوف نے ساری رات جاگ کر اُن کی تیمارداری کی، کبھی سر دبایا، کبھی پاؤں اور کبھی کمر۔ خلیل الرحمٰن اعظمی بیماری کے دوران تبدیلیِ آب و ہوا کے لیے کشمیر گئے تو وہاں ہمارے ہیرو نے کچھ خوش جمالوں سے اُن کا تعارف کرایا تاکہ بیمار کا احساسِ جمال تازہ دم رہے اور وہ جلد صحت یاب ہو جائے۔ اِن سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مظہر امام زبان و بیان ہی کی صحت کا نہیں، اپنے ہم عصروں کی جسمانی صحت کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔

مظہر امام دل کے بہت اچھے ہیں۔ کتاب میں جتنے لوگوں کا تذکرہ آیا ہے، اُن میں سے بیشتر کو اچھے لفظوں میں یاد کیا ہے، یہاں تک کہ خود اپنے آپ کو بھی بڑی محبت کی نظر سے دیکھا ہے۔ ہاں یہ احتیاط کی ہے کہ اپنے قلم کو براہ راست آلودۂ مدح نہیں کیا، دوسروں نے اُن کی جو تعریف کی ہے اُسے نقلِ کفر کفر نہ باشد کے مصداق نقل کردیا ہے۔ اس سلسلے میں اخباری کالموں اور رپورٹوں کے وہ اقتباسات بطورِ خاص توجہ کے مستحق ہیں جن میں مظہر امام کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ اس قسم کے اقتباسات کتاب میں شامل کر لیے گئے ورنہ شائقین کو اصل اخبارات تلاش کرنے میں خاصی دقت ہوتی۔

(۲۸؍جولائی ۱۹۹۴ء)

حاشیہ نویسی یا حاشیہ برداری

مشہور ہندوستانی ادیب مظہر امام کمال کے آدمی ہیں۔ اُن کی ادبی نیکیاں بے شمار ہیں جنھیں وہ دریا میں نہیں ڈالتے، کتابوں کی صورت میں شائع کر دیتے ہیں۔ یہ نیکیاں کسی اور کے کام آئیں یا نہ آئیں، خود اُن کے اپنے کام ضرور آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دنوں پہلے اُنھیں ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملا ہے جو ہندوستان کا ایک بڑا ادبی اعزاز ہے۔ ہم مظہر امام کو تہِ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اُن کی محنت ضائع نہیں ہوئی، ورنہ ساہتیہ اکیڈمی کا انعام حاصل کرنے کی تگ و دو میں خود ادیب ہی ضائع ہو جاتا ہے۔

مظہر امام کی تازہ ترین نیکی ''نصف ملاقات'' کے نام سے بازار میں آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ہی قرطاس و قلم سے بے تکلفی نہیں برتتے بلکہ ان دونوں کے حوالے سے دوسروں کو بھی خندہ ہائے بے جا کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اس کتاب میں مشاہیرِ ادب کے وہ خطوط شامل ہیں جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً مظہر امام کے خطوں کے جواب میں لکھے تھے۔ کتاب پر بطور مرتّب ڈاکٹر امام اعظم کا نام درج ہے لیکن خطوں پر حواشی خود مظہر امام نے لکھے ہیں۔ گویا مظہر امام اپنے حاشیہ بردار آپ ہی ہیں۔

جناب مرتّب اس کتاب پر چار صفحے کا دیباچہ لکھنے کے گناہ گار ضرور ہیں، ورنہ اُن کے دامن پر ترتیب و تدوین کی مناسبت سے کوئی داغ دھبا تو کیا، چھینٹا تک نظر نہیں آتا۔ مظہر امام چاہتے تو مرتّب کو اس چار صفحاتی زحمت سے بچا کر خود ایک جامع دیباچہ لکھ سکتے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساہتیہ اکیڈمی کا انعام ملنے کے بعد اُنھیں لکھنے لکھانے سے دلچسپی نہیں رہی۔ اگر ہمارا قیاس درست ہے تو مظہر امام کو یہ انعام بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔

دیباچے میں یہ تو بتا دیا گیا ہے کہ اِس مجموعے میں شامل تمام خطوط مرحومین نے لکھے ہیں لیکن یہ نہیں بتایا کہ انتقال سے پہلے لکھے تھے یا بعد میں۔ ہمارے خیال میں بہت سے خط ایسے ہیں جو عالمِ بالا سے پوسٹ کیے گئے ہوں گے کیوں کہ یہ ''سخن فہمیِ عالمِ بالا'' کے آئینہ دار ہیں۔ یعنی اِن میں مظہر امام کی شاعری کی بے حد و حساب تعریفیں کی گئی ہیں۔ عالمِ بالا سے آنے والے خطوں پر مفصل حواشی کی ضرورت تھی تاکہ جو تعریفی نکات مکتوب نگاروں کے ذہن میں نہیں آئے، حواشی میں آجاتے۔

دیباچے میں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ آخر وہ تمام لوگ انتقال کیوں کر گئے جنھوں نے مظہر امام کے نام خط لکھے تھے۔ کتاب کے غائر مطالعے کے بعد ہم اِس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اتنے بہت سے مکتوب نگاروں کا ایک ہی کتاب میں انتقال کر جانے کا سبب یہ ہے کہ جناب مظہر امام نے اِن سب کو نہ صرف اپنے کلام کے مجموعے بھیجے بلکہ اپنے کلام کے بارے میں رائے بھی طلب کی۔ یہ بات ہم نے ازرہِ مذاق نہیں کہی، کتاب میں اس کا ثبوت موجود ہے۔

حسن نعیم ایک خط میں لکھتے ہیں: ''تم نے میری رائے اپنی نظم و غزل پر مانگی ہے... مجھ سے اتنا لمبا خط لکھوانا چاہتے ہو جس کو لکھنے کے بعد میں جاں بر نہ ہوسکوں گا اور جس وقت تم میری اچانک موت پر مرثیہ لکھتے ہوگے، اُس وقت خود میرا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہوگا کہ آج یہ نوجوان نقاد خط لکھتے لکھتے کس طرح مر گیا''۔

یہ اقتباس جس خط کا ہے، وہ خاصا طویل ہے اور اِس میں مظہر امام کی ایک غزل اور ایک نظم پر خاصا دل خوش کن تبصرہ ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حسن نعیم کے سانحۂ مرگ پر مظہر امام نے کوئی مرثیہ لکھا یا نہیں۔ اگر لکھا تھا تو خط کے ساتھ اُسے بھی شائع کر دینا چاہیے تھا تاکہ یہ معلوم ہو جاتا کہ ادب کی خاطر جان کی بازی لگا دینے والے نقصان میں نہیں رہتے اور خود ادبِ عالیہ کا موضوع بن جاتے ہیں۔

کلام پر رائے دینے والے نہ سہی، اپنے کلام پر رائے لینے کے سلسلے میں مظہر امام خاصے فراخ دل ہیں۔ گزشتہ ربع صدی میں انتقال کرنے والا شاید ہی کوئی ادیب ہوگا جس کا مظہر امام نے گھیراؤ نہ کیا ہو۔ (''گھیراؤ'' ایک سیاسی اصطلاح ہے، مظہر امام کے طریقۂ واردات کی وضاحت کے لیے اس سے بہتر لفظ نہیں مل سکتا)۔ حد تو یہ ہے کہ اُنھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو بھی نہیں بخشا جو اُس وقت جمہوریۂ ہند کے نائب صدر تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خط میں جس مروت سے کام لیا ہے، وہ بے مثال ہے۔ فرماتے ہیں: ''میں ایک نشست میں زیادہ شعر نہیں پڑھتا۔ ٹھہر ٹھہر کر دم لے کر چلتا ہوں لیکن آپ کی غزلیں جو رات شروع

کیں تو سب ہی پڑھ ڈالیں۔ کئی شعروں کو دیر تک گنگنایا... نظمیں شروع کرنے سے پہلے غزلیں پھر کم از کم ایک مرتبہ اور پڑھوں گا''۔

ہم نے یہ سنا تھا کہ جمہوریۂ ہند کے نائب صدر کو تو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ مگر اب معلوم ہوا کہ مظہر امام کا مجموعۂ کلام اگر ہاتھ میں ہو تو حاکم امورِ سلطنت کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتا ہے... لیکن سبھی سخن فہم ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرح بامروّت نہیں ہوتے۔ بعضوں نے تو خاصی بے مروّتی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً:

''آپ کا کلام نگاہِ انتقاد سے کبھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی کوئی رائے قائم کی''۔ (اثر لکھنوی)

''آپ کی نظمیں جہاں کہیں مل جاتی ہیں، ضرور دیکھتا ہوں لیکن ظاہر ہے کہ ایک ایک نظم کا تاثر کچھ دنوں بعد زائل ہو جاتا ہے''۔ (احتشام حسین)

بعض ادیبوں نے ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ جمیل مظہری لکھتے ہیں: ''آپ کی شاعری کے متعلق چند سطریں کیا لکھوں۔ آپ کی شاعری تو ایک تقریظ کی مستحق ہے''۔ پرویز شاہدی کہتے ہیں: ''آپ کے کلام کے محاسن کا احاطہ (کرنے کے لیے) ایک طویل مضمون کی ضرورت ہے جو میرے جیسے احدی آدمی کے بس کی بات نہیں ہے''۔ کرشن چندر بھی ایک ''اچھا سا نوٹ'' لکھنے کا وعدہ کرتے رہے مگر ایفائے وعدہ کی نوبت نہ آئی۔ ظ۔ انصاری نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ اُن کی کتابوں کی الماری سے مظہر امام کا مجموعۂ کلام غائب ہو گیا ہے۔ سہیل عظیم آبادی نے پہلے تو یہ کہہ کر جان چھڑانی چاہی کہ میں کوئی صاحب نظر نقاد نہیں ہوں جو میری رائے کی کوئی وقعت ہو، لیکن جب مظہر امام نے تقاضا جاری رکھا تو اُنھوں نے یہ لکھا: ''اِدھر شعرائے کرام سے جو تجربے ہوئے ہیں، اُن کے پیشِ نظر میں احباب کو مشورہ دیتا ہوں کہ شاعری ترک کردو''۔ اچھا مشورہ ہے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

رائے نہ دینے والوں کی طرح بعض رائے دینے والوں نے بھی کچھ کم ستم ظریفی سے کام نہیں لیا۔ راجندر سنگھ بیدی نے مظہر امام کا مجموعۂ کلام پڑھ کر لکھا: ''اس میں سیکڑوں ایسے شعر ہیں... جو فرزانگی کی حدوں کو پھاند گئے ہیں۔'' اس رائے کی وضاحت اُنھوں نے ان الفاظ میں کی ہے: ''انسانی ارتقا میں کوئی منزل ایسی ہے جس میں شاعر شعر سے بھی گزر جاتا ہے''۔ بیدی کی رائے اگر درست ہے تو پھر یہ سمجھنا چاہیے کہ مظہر امام کے شعر فرزانگی کی حدوں کو اور خود مظہر امام اپنے شعروں کو پھاند چکے ہیں۔

سب سے دلچسپ رائے راجہ مہدی علی خان کی ہے۔ وہ مجموعۂ کلام ''زخمِ تمنا'' کی داد ان لفظوں میں دیتے ہیں: ''کاش زخمِ تمنا کا آپ انگریزی اور رشین میں ترجمہ کرائیں۔ دونوں

زبانیں مجھے تھوڑی تھوڑی آتی ہیں۔ دوبارہ زخم تمنا کو غیر زبانوں میں پڑھوں گا''۔ اس تکلف کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ راجہ مہدی علی خان کو ''زخم تمنا'' کا اردو متن پوری طرح سمجھ میں نہیں آیا ہوگا۔ اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ عالمی ادب کے بہت سے فن پاروں کو ہم ترجمے ہی کے ذریعے بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی مرحوم نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔ ''زخم تمنا'' اُن سے کوئی صاحب مانگ کر لے گئے اور واپس نہ کی۔ کتاب کو سامنے رکھے بغیر اُنھوں نے رائے لکھ دی اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر فرما دیا: ''ممکن ہے مجھے غلط کتاب یا اُس کے مضامین یاد ہوں۔ اگر ایسا ہو تو اپنے خیالات واپس لیتا ہوں اور معافی کا خواست گار ہوں''۔ مظہر امام کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے غلط کتاب پر یعنی کسی اور کی کتاب پر رائے واپس نہیں کی اور اُسے بھی اپنے ادبی کھاتے میں جمع کر لیا۔

مرتب نے دیباچے میں یہ بھی لکھا ہے کہ تمام خطوط بغیر کسی ترمیم یا تبدیلی کے من و عن شائع کیے گئے ہیں۔ ''صرف ایک جگہ ایک زندہ شخصیت کے بارے میں ایک خاطر شکن بات آگئی تھی، اُسے نکال دیا گیا ہے''۔ معلوم ہوتا ہے کہ مرتب نے خطوں کو غور سے نہیں پڑھا۔ اِس میں کئی زندہ لوگوں کی خاطر شکنی تو کیا دنداں شکنی کا سامان موجود ہے۔ مثلاً خلیل الرحمٰن اعظمی نے ایک خط میں لکھا ہے: ''ڈاکٹر محمد حسن کی تنقیدیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لیے کہ ایک مضمون میں جن باتوں کو وہ عیب کہہ کر اُنھیں مطعون کرتے ہیں، دوسرے مضمون میں اُنھیں باتوں کو وہ محاسن کے خانے میں رکھتے ہیں''۔

حسن نعیم نے لکھا ہے کہ کلیم الدین احمد کی شاعری پر ڈاکٹر ممتاز احمد کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے، وہ خود کلیم الدین احمد کی لکھی ہوئی ہے۔ حسن نعیم یہ بھی لکھتے ہیں: ''پروفیشنل نقاد تو بک چکے، دس ہزار روپے لے کر صلاح الدین پرویز پر... مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ وہ خود روپے کے زور پر ادب میں داخل ہونے کو فخر کی بات سمجھتے ہیں... بے چارے محمد علوی نے کتنے پیسے ضائع کیے، اس کی بھی آپ کو خبر ہوگی''۔

کیا ان سب باتوں سے ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر ممتاز احمد، صلاح الدین پرویز اور محمد علوی کی خاطر شکنی نہیں ہوتی؟ خیر یہ تو اغیار ہیں، کتاب میں خود مظہر امام کی خاطر شکنی کا خاصا سامان موجود ہے۔ظ۔ انصاری نے اپنے خطوں میں مظہر امام کی زبان کی کتنی ہی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے اور مخمور جالندھری نے شعری اسقام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس شاعر کو ساہتیہ اکیڈمی کا انعام مل چکا ہو، اُس کے بارے میں ایسے معاندانہ خطوط شائع کرنا ادب کے نام

پر بے ادبی کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔

خطوط پر اگرچہ کہیں کہیں حواشی لکھے گئے ہیں، لیکن پھر بھی ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں بات واضح نہیں ہوتی۔ مثلاً مخمور جالندھری (مدیر ''شاہراہ'' دہلی) نے ایک خط میں مظہر امام کو لکھا ہے: ''تم نے اپنی شاعری پر جو مضمون بھجوایا ہے، وہ اگلے شمارے میں شامل کر رہا ہوں''۔ اس جملے کی وضاحت ضروری تھی۔ حاشیے میں یہ بتانا چاہیے تھا کہ مظہر امام نے اپنی شاعری پر جو مضمون بھجوایا تھا، وہ انھوں نے خود لکھا تھا یا کسی اور سے لکھوایا تھا۔

(۶/اپریل ۱۹۹۵ء)

غیر شاعرانہ شاعری

جناب راغب مراد آبادی کے ہم بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی تازہ کتاب "روشنیوں کے شہر" مطالعے اور تبصرے کے لئے عنایت فرمائی ہے۔ کتاب کے پہلے صفحے پر انہوں نے ازراہِ لطف وکرم ہمارے لئے جو تعریفی کلمات لکھے ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اپنے بارے میں ہماری تحریروں کو وہ نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ مزید خامہ فرسائی کے متمنی بھی ہیں۔ اس حوصلہ افزائی کے شکریہ ادا کرنے کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں، البتہ کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہیں اور وہی ہم موصوف کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔

جو لوگ شاعری اور موزونی طبع کے نازک فرق کو سمجھتے ہیں، وہ اس سے ضرور اتفاق کریں گے کہ موجودہ دور میں جناب راغب جیسا قادر الکلام کوئی دوسرا نہیں ہے۔ وہ جس موضوع پر عنایت کی نظر کرتے ہیں، وہ رواں دواں مصرعوں میں ڈھل جاتا ہے۔ اگر کبھی تعزیراتِ پاکستان کو منظوم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو یہ کام صرف راغب صاحب ہی انجام دے سکیں گے کہ انہیں عروض کی ہر بحر پر عبور حاصل ہے۔ صرف عروض کی بحروں پر پوری اترنے والی شاعری بالآخر بحرِ عرب کے لئے بھی قابلِ قبول ہو جاتی ہے اور یوں عروض کی بحروں میں ایک اور بحر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

پیپلز پارٹی کے دور میں کراچی پر جو قیامت گزری، جناب راغب نے اسے بچشمِ خود دیکھا ہے اور زیرِ نظر کتاب میں بقلم خود بیان کر دیا ہے۔ کتاب میں کچھ نظمیں اور بہت سی رباعیات جن میں دہشت گردی اور دہشت گردوں کو موضوع بنایا گیا ہے، نیز یکم نومبر سے ۳۰ دسمبر ۱۹۹۵ء تک

کے اخبارات کی خاص خاص خبروں کو منظوم کر دیا گیا ہے۔ رباعی سے جناب راغب کو طبعی مناسبت ہے۔ بقول دیباچہ نگار سحر انصاری ''رباعی پر راغب صاحب کو جو ملکہ حاصل ہے، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ اس مشکل صنفِ سخن کو وہ اس طرح برتتے ہیں جیسے کوزہ گر اپنی مٹی کو۔'' کوزہ گر مٹی سے کوزہ بناتا ہے، راغب صاحب نے یہ کمال دکھایا ہے کہ رباعی کو مٹی میں ملا دیا ہے اور پھر اس مٹی کو بطور شاعری پیش کیا۔ ذرا اس شاعری کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجئے۔ ٦-نومبر ١٩٩٥ء کے اخبار ''جنگ'' میں خبر چھپی کہ نامعلوم افراد نے نارتھ ناظم آباد میں ایک معمر خاتون کا گلا کاٹ دیا۔ راغب صاحب شاعری کا گلا کاٹتے ہوئے فرماتے ہیں:

سال و سن کا لحاظ بھی تو نہ کیا
کیا ظالموں کے دل میں نہ تھا، خوفِ خدا
افسردہ نہ کیوں ہو، نارتھ ناظم آباد
خاتون معمر کا گلا کاٹ دیا

روزنامہ ''عوام'' کراچی میں ١١-نومبر ١٩٩٥ء کو ایک خبر چھپی کہ لیاقت آباد میں بوری بند لاش ملی۔ راغب صاحب اس خبر کو رباعی کی بوری میں یوں بند کرتے ہیں:

خربوزے نہ آم کی کوئی قاش ملی
آئینۂ سفاکی اوباش ملی
ہیں آہ بلب اہلِ لیاقت آباد
بوری میں یہاں بند انہیں ایک لاش ملی

جس طرح بوری میں خربوزے اور آم کی قاش کو تلاش کرنے کا خیال بالکل اچھوتا ہے، اسی طرح سفاکیِ اوباش کے آئینے کو مؤنث بنا دینا بھی بالکل نئی بات ہے۔

روزنامہ ''عوام'' میں ١٣-نومبر ١٩٩٥ء کو ایک ٣٥ سالہ شخص عبدالوحید کے قتل ہونے کی خبر شائع ہوئی۔ اس خبر کو منظوم کرتے ہوئے چوتھے مصرعے میں شاعر نے اپنے تخلص کو جس طرح استعمال کیا ہے، اس کی داد اہلِ نظر ہی دے سکتے ہیں۔

دہشت گردوں کا منہ ہو یا رب کالا
نازوں سے تھا ماں باپ نے جس کو پالا

ان فتنہ گروں نے مار ڈالا آخر
راغب، عبدالوحید ،پینتیس سالہ

۵-دسمبر ۱۹۹۵ء کے "جنگ" میں خبر چھپی۔لیاقت آباد میں چھاپہ۔۹راکٹ،۲۲بم برآمد۔ملزم فرار ہو گئے۔اس خبر کو شاعرانہ محاسن کے ساتھ یوں پیش کیا گیا ہے:

چھاپے سے نہ بچ سکا لیاقت آباد
برآمدِ اسلحہ تھی اس کی بنیاد
۲۲ ملے ہیں بم فقط نو راکٹ
ملزم تھے نہ ہاتھ آئے ،بر آئی نہ مراد

مصرعے میں لفظ "فقط" کے استعمال سے شاعر نے اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ بموں کے مقابلے پر راکٹوں کی تعداد کم تھی۔

راغب صاحب نے ہلاکتوں کی خبروں کو بھی نہایت خوب صورت انداز میں منظوم کیا ہے۔فرماتے ہیں:

کورنگی میں فائرنگ سے بھگدڑ جو مچی
زخمی ہوئے دس،سات کی تو جان گئی
خاتون بھی ہے ایک انہیں میں شامل
شہرِ قائد میں اُف یہ دہشت گردی

شاعر نے یہ نہیں بتایا کہ خاتون زخمیوں میں شامل ہے یا ہلاک شدگان میں۔یہ بالکل غالب کا سا انداز ہے۔وہ بھی اپنے بعض شعروں میں مفہوم کے کسی پہلو کو تشنۂ اظہار رہنے دیتے تھے تاکہ قاری اپنی عقل سے کام لے کر معنی کی گم شدہ کڑی کو تلاش کر سکے۔

جناب راغب کے شاعرانہ کمالات سے آگاہی کے لئے صرف اتنے ہی نمونے کافی ہیں۔جنہیں اس قسم کی ہلاکتوں کی اخباری شاعری سے دلچسپی ہو،انہیں اصل کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے لیکن اس میں احتیاط ضروری ہے کہ کتاب کے مطالعے سے بھی ہلاکتوں میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخباری خبروں کو منظوم کرنے کا مقصد کیا ہے؟اس کے لئے کتاب کی تصنیف کی پس منظر جاننا ضروری ہے۔۲-جون ۱۹۹۶ء کو راغب صاحب نے سابق

وزیراعظم بے نظیر بھٹو کا ایک قصیدہ لکھا جو ہم ایک کالم میں بخطِ شاعر شائع کر چکے ہیں۔ اس قصیدے کے عوض بے نظیر نے راغب صاحب کو ایک لاکھ روپے کے انعام سے نوازا۔ کراچی کے ادبی حلقوں میں اس پر شدید ردِعمل ظاہر کیا گیا کہ راغب صاحب نے کراچی کے شہیدوں کے خون بہا وصول کیا ہے۔ اس داغ کو دھونے کے لئے زیرِ نظر کتاب شائع کی گئی ہے۔ اس پر تاریخ طباعت ۳۱- دسمبر ۱۹۹۵ء درج کی گئی ہے اور یہ نہ سوچا گیا کہ جس کتاب میں ۳۰- دسمبر ۱۹۹۵ء کی ایک منظوم خبر شامل ہے، وہ دوسرے ہی دن کس طرح منظرِ عام پر آسکتی ہے۔

مصنف کی ایک بات قابلِ داد ہے کہ انہوں نے کراچی کے حالات پر کتاب لکھتے ہوئے کسی مصلحت سے کام نہیں لیا اور جس بات کو درست سمجھا ہے، اس کا برملا اظہار کیا ہے۔ جنرل نصراللہ بابر نے '' دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے کے بہانے خود جس دہشت گردی کا مظاہرہ کیا، اس کی داد راغب صاحب نے ان الفاظ میں دی ہے:

ہر چند کہ بد نام ہے دہشت گردی
کیا بات ہے کیوں عام ہے دہشت گردی
جنرل بابر کا نام سن کر راغب
کیا لرزہ بر اندام ہے دہشت گردی

اہلِ کراچی پر جو قیامت گزری، اسے راغب صاحب اہلِ کراچی کے اعمال کی سزا قرار دیتے ہیں:

یہ روشنیوں کا شہر اللہ اللہ
نورِ چشمِ سپہر اللہ اللہ
کس کے اعمال کی سزا ہے کہ یہ شہر
ہے زیرِ عتاب و قہر اللہ اللہ

وہ اہلِ کراچی کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں:

مانگو اللہ سے معافی جھٹ پٹ
دن امن واماں کے کاش جلد آئیں پلٹ

نوبت نہ کہیں فاقہ کشی تک پہنچے
ہنگاموں نے کر دی ہے معیشت تلپٹ

کراچی کے شام کے اخباروں نے جس ہمت وجرأت کے ساتھ رپورٹنگ کی، اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ سابقہ حکومت نے بیک جنبش قلم شام کے چھ اخبار بند کر دیئے تھے لیکن راغب صاحب کا خیال ہے کہ یہ اخبار اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے چٹ پٹی خبریں شائع کرتے تھے:

ممکن ہے بڑھے آمدنی یاروں کی
خبریں بھی ہیں چٹ پٹی خبر داروں کی
آئینۂ دل کو جو مکدّر کر دیں
وہ سرخیاں ہیں شام کے اخباروں کی

کراچی میں پولیس نے جو ظلم کیے اور جعلی مقابلوں میں جو بے شمار لوگ قتل کیے، پوری کتاب میں ان کا کوئی ذکر نہیں، لیکن تھانوں کے خلاف جو جوابی کارروائیاں ہوئیں، راغب صاحب ان پر افسردہ خاطر نظر آتے ہیں اور اپنے اس غم کا انہوں نے کئی رباعیوں میں اظہار کیا ہے۔ مثلاً

آجائیں نہ زد میں اک نہ اک دن ہم بھی
بے شک سوہانِ روح ہے یہ غم بھی
ہاں گلشنِ اقبال کے تھانے ہی پر
راکٹ بھی گرے ہیں اور دستی بم بھی

کراچی میں آئے دن ہڑتالیں ہوتی تھیں اور یہ ہڑتالیں، غلط یا درست، احتجاج کا ایک ذریعہ تھیں۔ راغب صاحب نے اپنی کتاب میں ان ہڑتالوں کا جہاں کہیں ذکر کیا ہے، سابقہ حکومت کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ مثلاً

کیوں اہلِ کراچی کے نہ گم ہوں اوسان
ہے آہ بلب اسٹاک ایکسچینج کی جان

دہشت گردی سے اور ہڑتالوں سے

دو سال میں دس کھرب روپے کا نقصان

ہنگاموں کے دنوں میں ایک مرتبہ بے نظیر بھٹو کراچی آئیں تو راغب صاحب نے خوش ہو کر یہ رباعی لکھی:

دہشت گردی کا زور اے کاش ہو کم

افراتفری سے آ گیا ناک میں دَم

حالات کے تجزیئے کی خاطر ہیں مقیم

منگل سے کراچی میں وزیر اعظم

کتاب میں جو چند نظمیں شامل ہیں، ان کا معیار بھی رباعیوں سے کم نہیں ہے۔ ایک نظم کے چند شعر سنئے اور شاعر کی بلند خیالی کی داد دیجئے:

جاں بحق مُنّی کی بیٹی ہو گئی

ہو گیا کلّن کا برخوردار قتل

جان سے کچھ آج لانڈھی میں گئے

ہوں گے کل کچھ اہلِ گولی مار قتل

دیکھئے ہوتا ہے کیا ردِّ عمل

ہو گیا ہے ایک تھانے دار قتل

ایم کیو ایم کے رہنما الطاف حسین کے بیرونِ ملک قیام پر راغب صاحب کا تبصرہ بڑا معنی خیز ہے:

خیر ہو تیری نا خدا، ناؤ جو ڈوبنے لگی

اس سے تو خود اتر گیا، مجھ کو سوار کر دیا

حالاتِ حاضرہ کو شاعری کا موضوع بنانا ایک نہایت مشکل کام ہے، اس کے لئے صرف قادرالکلامی کی نہیں، اس نظر کی بھی ضرورت ہے جو حالات و واقعات کے باطن میں اترنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اہلِ اردو میں یہ نظر صرف اکبرالہ آبادی، ظفر علی خاں اور رئیس امروہوی کے پاس تھی۔ کوئی چوتھا شاعر ایسا نہیں ہے کہ اس سلسلے میں اس کا نام لیا جائے۔ ویسے ہر اچھا شاعر

اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور تخلیقی سطح پر اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ کراچی کے حالات سے متاثر ہو کر بعض غزل گو شاعروں نے اشاروں کنایوں میں بہت کچھ کہا ہے لیکن ایک جدید شاعرہ گلنار آفریں نے کراچی کے حالات کو جس تخلیقی حسن کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ گلنار آفریں کا مجموعۂ کلام ''تیشۂ غم'' اگست ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں دو درجن سے زیادہ نظمیں کراچی کے بارے میں ہیں اور ہر نظم میں ایک سچے شاعر اور حساس شہری کا کرب جھلکتا ہے۔ گلنار آفریں نے بڑی جرأت اور بے باکی سے وہ تمام باتیں کہہ دی ہیں جو ان کے دور کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کہہ سکا۔ کراچی کے شہریوں پر ماضی قریب میں جو قیامت گزری، وہ راغب مراد آبادی کے لئے صرف خبر کا درجہ رکھتی ہے، جسے صحافیانہ انداز سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ گلنار آفریں کے لئے یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کے بیان کے لئے فن کارانہ بصارت و بصیرت کی ضرورت ہے۔ گمان غالب ہے کہ راغب مراد آبادی نے گلنار آفریں کے مجموعہ کلام کی مقبولیت سے متاثر ہو کر ہی اپنا مجموعہ مرتب کیا، لیکن بات بنی نہیں۔

گلنار آفریں کی ایک مشہور نظم ہے: ''قائد اعظم سے خطاب'' جس میں روحِ قائد کو اپنا پاکستان دیکھنے کی دعوت دی گئی ہے اور کراچی کے حوالہ سے پوچھا گیا ہے کہ کیا یہ وہی پاکستان ہے جس کے لئے ان گنت قربانیاں دی گئی تھیں اور جہاں آج یہ حال ہے کہ ''چور، لٹیرے، قاتل سارے شہر کے چوکیدار ہوئے۔'' اسی انداز کی دو تین نظمیں راغب مراد آبادی نے بھی لکھی ہیں لیکن انہوں نے کراچی اور اہلِ کراچی کی جو تصویریں پیش کی ہیں، وہ انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ مثلاً ایک نظم میں وہ اہلِ کراچی کے بارے میں لکھتے ہیں:

کیا حفظِ مراتب ہوتا ہے، یہ رسم یہاں افسانہ ہے
محرومِ محبت ہیں آنکھیں، اخلاص سے دل بیگانہ ہے
آتے نہیں کام اپنے بھی یہاں، پڑتا ہے کسی پہ وقت اگر
اللہ یہ زوالِ نوعِ بشر، اللہ یہ دورِ دولت و زر
جو چشمِ ہوس سے پنہاں تھے، جلوے وہ یہاں مستور نہیں
چہروں پہ حیا کا رنگ نہیں، آنکھوں میں وفا کا نور نہیں

عصمت کے جواہر بکتے ہیں ہر سمت یہاں بازاروں میں
افسردہ نظر آتے ہیں جو گل ہوتے ہیں گلے کے ہاروں میں

کراچی کے زخموں پر ایسا نمک شاید ہی کسی نے چھڑکا ہوگا۔ اس نظم کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ ۱۹۴۹ء میں لکھی گئی تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی نظم کو ۱۹۹۶ء میں شائع کرنے کی کیا ضرورت تھی، جس میں اہلِ کراچی کو اخلاص، حیا اور وفا سے بیگانہ بتایا گیا ہو اور کراچی کے بازاروں میں عصمت کے جواہر بکتے ہوئے دکھائے گئے ہوں۔

شاعری پر شب خون

شمس الرحمٰن فاروقی اردو کے اُن چند نقادوں میں سے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں رجحان ساز نقاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی گواہی محمد حسن عسکری بھی دے چکے ہیں، جنھوں نے ایک مرتبہ یہ لکھا تھا کہ حالی کے بعد اردو تنقید فاروقی کے ذریعے ایک نئے معیار سے آشنا ہوئی ہے۔ فاروقی کا مطالعہ حیران کن حد تک وسیع ہے۔ وہ بیک وقت مشرق و مغرب کی ادبی روایات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ انھیں عروض اور معانی و بیان جیسے بے برکت علوم پر بھی ماہرانہ دسترس حاصل ہے۔

فاروقی ۱۹۶۶ء سے رسالہ "شب خون" شائع کر رہے ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں میں اس رسالے نے جدید ادبی رجحانات کو متعارف کرانے میں اور جدید ادیبوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ "شب خون" رسالہ نہیں ایک تحریک ہے جو اردو ادب میں نئے خیالات و رجحانات کی آب یاری کر رہی ہے۔ جس طرح زلزلے اور سیلاب جیسی آفاتِ ارضی کے متاثرین بے شمار ہوتے ہیں، اسی طرح "شب خون" سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے۔

جدیدیت اور جدیدیوں سے ہماری کوئی ذہنی قربت نہیں ہے۔ ہم پرانے زمانے کے آدمی ہیں۔ ہمیں کسی جدید چیز میں اس وقت تک کوئی خوبی نظر نہیں آتی جب تک اس پر قدامت کی گرد جم نہ جائے۔ فاروقی کو بھی ہم نے اسی لیے پسند کیا ہے کہ انھیں لکھتے ہوئے ۳۰-۳۵ برس گزر چکے ہیں۔ اپنی اساسی قدامت پسندی کے باوجود ہم "شب خون" کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ جب بھی اس کا تازہ شمارہ آتا ہے تو ہم سب کام چھوڑ کر اس کا مطالعہ کرتے

ہیں اور مطالعے سے جو وقت بچتا ہے سب کام چھوڑنے پڑتے ہیں یوں کہ پچھلے دنوں تک ہم اس لائق نہیں رہتے کہ کوئی کام کر سکیں۔ حال ہی میں خوش قسمتی سے "شب خون" کے پانچ شمارے ایک ساتھ ملے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دولت ہاتھ آگئی ہو۔ دولت بھی وہ جس کے بارے میں یگانہ نے کہا تھا:

دنیا کا کیا بھروسا، دولت کا کیا ٹھکانا
دولت تو دولت آخر لٹنے کی نوبت آئی

سو اس دولت کو بے دریغ لٹانے کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

"شب خون" کے تازہ شماروں میں سے کسی ایک میں اختر الایمان کا وہ معرکہ آرا انٹرویو بھی شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اقبال، فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور دوسرے کئی شاعروں کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہترین اردو شاعری، پاکستان میں نہیں، ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ اختر الایمان کا یہ فیصلہ پاکستانی شاعروں کو ضرور ناگوار گزرے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ ہماری شاعری کا مطالعہ کیے بغیر یک طرفہ فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ آزردہ خاطر نہ ہوں۔ اختر صاحب نے جو فیصلہ دیا ہے، اس کے لیے انھیں پاکستانی تو کیا، ہندوستانی شاعری بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ فیصلہ اختر صاحب نے اپنی شاعری کے حوالے سے دیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہیں، اگر وہ بھوٹان کے باشندے ہوتے تو پھر بہترین شاعری وہیں ہو رہی ہوتی۔

ہم نے چوں کہ انصاف پسند طبیعت پائی ہے، اس لیے ہمارے دل نے یہ گواہی دی کہ اختر الایمان جیسا بڑا شاعر غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے یقیناً اس کی بنیاد محض دلائل پر نہیں ٹھوس حقائق پر ہوگی۔ صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہم نے "شب خون" کے پانچوں شماروں میں شائع شدہ غزلوں کو بغور پڑھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اختر صاحب مطالعے کے بغیر جس نتیجے پر پہنچے تھے، مطالعے کے بعد ہمیں اسی نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اب ہماری بھی یہی رائے ہے کہ بہترین اردو شاعری ہندوستان ہی میں ہو رہی ہے۔ پاکستانی شاعر خواہ مخواہ پڑھنے والوں کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ ہندوستانی شاعروں کی تقلید کر کے اپنی شاعری کو بہتر بنائیں، ورنہ کوئی دوسرا آبرو مندانہ شغل اختیار کریں تاکہ سیاست کی طرح شاعری بھی ہمارے ملک کی رسوائی کا باعث نہ ہو۔

ہندوستان کی اردو شاعری کی خصوصیت کو ایک کالم میں سمیٹنا ممکن نہیں، اس سے لیے

دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ لہٰذا ہم مختصر طور پر خاص خاص خوبیوں ہی کی طرف اشارہ کریں گے تاکہ کسی حد تک یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستان کی اردو شاعری، پاکستان کی شاعری سے کیوں بہتر ہے اور عالمی ادب کی سطح پر اس کی الگ شناخت کیا ہے۔ ہم بحث کے دوران صرف شعر درج کریں گے، شاعروں کے نام نہیں بتائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعروں کے صرف نام ہی الگ الگ ہیں، باقی سب کچھ یعنی کلام اور انداز بیان وغیرہ ایک ہی جیسا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری غزلیں کسی ایک شاعر نے لکھ کر بہت سے شاعروں کے نام سے چھپوا دی ہیں۔ ممکن ہے یہ ''ایک شاعر'' خود شمس الرحمن فاروقی ہوں۔ انھوں نے بڑا زرخیز ذہن پایا ہے۔ ان کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ ۲۰۔۲۵ مختلف ناموں سے غزلیں لکھ دیں بہرحال اصل شاعر کوئی بھی ہو، ہم شاعری کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلی چیز جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر کو نئے نئے مضمون سوجھتے ہیں یا یوں کہیے کہ خاصی دور کی سوجھتی ہے۔ مثلاً:

کپڑوں کی الماری کھولے کھڑا ہوں میں حیران
نہیں ہے میرے ناپ کا اس میں کوئی ایک لباس

کسی دوسرے کے کپڑوں کی الماری کھول کر حیران ہونا ایک بالکل نیا خیال ہے۔ اپنے کپڑوں کی الماری شاعر نے شاید اس لیے نہیں کھولی کہ اس میں سوائے خلعت سخن کے کچھ نہیں تھا لہٰذا رقیب کے کپڑوں کی الماری کھول لی۔

حیران ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کو چونکنے کا بھی شوق ہے۔ اس شوق کی خاطر فرماتے ہیں:

رستے میں کچھ تو ایسا ہو جس کو دیکھ کے چونک پڑیں
اور نہیں تو دو کاریں ہی آپس میں ٹکرا جائیں

جس راستے میں کاروں کے ٹکرانے کا منظر دیکھنے کی خواہش ہے، وہ راستہ کالج کی طرف جاتا ہے کیوں کہ جناب شاعر ابھی زیر تعلیم ہیں۔ ایک شعر میں انھوں نے اپنا تعلیمی نصاب بھی بتا دیا ہے:

مرے کالج میں ہر جانب ترا ہی نام لکھا ہے
تجھے ہی پڑھنے جاتا ہوں تجھے ہی پڑھ کے آتا ہوں

جو شاعر دوران تعلیم ایسے عمدہ شعر کہہ سکتا ہو تعلیم کی تکمیل کے بعد تو معلوم نہیں وہ کیا قیامت ڈھائے گا لیکن قیامت ڈھانے سے پہلے بھی اُسے کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ مثلاً

دیتے، چلتی ہوئی جوتیاں اور کھڑی ہوئی بسیں بھی نظر آتی ہیں:

جرابیں اور جوتیاں تو اُس کی
سفر کے سارے عذاب میرے

☆

سب تھکے ہارے اڈوں کو گھر چھوڑ کر
اپنے اڈوں پہ خالی بسیں رہ گئیں

دوسرا شعر علامتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ شعروں کو خالی
بسیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ مسافران معانی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔
شب خونیوں نے غزل کا دامن اتنا وسیع کر دیا ہے کہ اس میں مشرق سے مغرب
تک، جنوب سے شمال تک اور جنوری سے دسمبر تک کی ہر چیز سما گئی ہے:

تمام رنج و ملال اوڑھے
بدن نے سب ماہ و سال اوڑھے
میں مغربوں کے سفر میں مشرق
جنوب میں بھی شمال اوڑھے
لہو میں سلگا کے جون موسم
ملے دسمبر میں شال اوڑھے

ان شعروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شال میں لپیٹ کر بھی اچھے شعر کہے جا سکتے ہیں۔
اوڑھنے بچھونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شاعری میں ایسے فلسفیانہ مسائل پر بھی
اظہارِ خیال کیا گیا ہے جن پر پوری پوری کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ
صرف دو دو مصرعوں میں بات مکمل کر دی گئی ہے:

محفل میں رات گیت یہ تھا مجھ سے وصل کر
گویا مغنّیہ کو کوئی کام ہی نہیں

☆

گناہ کھلتے ہیں میرے کس کس آنگن میں
یہ بھید مرنے سے پہلے مجھے بتانے ہیں

مگر شاعر یہ بھید نہیں بتائے، البتہ اس نے ایک اور اہم راز فاش کر دیا ہے:

گئے سال کی روشنی پی گیا
نئے سال کا یہ کیلنڈر سیاہ

غزل میں پیش ہونے کا اگر کوئی نئی بات نہیں تو نئی بات یہ ہے کہ غیر مردف غزل میں قافیہ مصرعے کے آخر میں آتا ہے، لیکن مندرجہ بالا شعر میں شروع میں آیا ہے۔ "سنے" اور "سنے" سے دونوں مصرعوں کا آغاز صوتی اعتبار سے ہم معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی شاعر غزل کی ہیئت میں نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر قافیہ مصرعوں کے درمیان لایا جائے۔

ہم نے اب تک جو شعر پیش کیے ہیں، وہ موضوعات اور لفظیات کے اعتبار سے جدید ترین ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ زبان کی شاعری نہیں کی جا رہی۔ کی جا رہی ہے اور خوش ذوقی سے کی جا رہی ہے۔

نہیں ابھی تو گیا اس سے سب جان کر کے
الا دے گا ایمان قربان کر کے
سمجھ بوجھ کے خوب پہچان کر کے
وہ جب مجھ سے ہو تو انجان کر کے

اسی طرح سہل ممتنع کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں مثلاً

چپ دیوار سایہ دھوپ جنگل
چلے آؤ میں کوئی نہیں ہے

سہل ممتنع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر شعر کو نثر میں تبدیل کیا جائے تو لفظوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اس شعر کو نثر میں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ پہلے ہی نثر میں ہے۔ مصرعوں میں تبدیلی کی بھی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ تبدیلی اسی چیز میں کی جا سکتی ہے جو موجود ہو۔

ہم نے اوپر جو شعر مثالاً درج کیے ہیں، ایسے ہی تقریباً دو سو شعر اور بھی "شب خون" کے پیش نظر شماروں میں موجود ہیں، لیکن ان شعروں کو نقل کرنے کے لیے جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے، اُس کے فقدان کے سبب ہم نقل نویسی کی مزید خدمت انجام دینے سے معذور ہیں۔ البتہ پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ تھوڑے لکھے کو بہت جانیں اور یہ مان لیں کہ ہندوستان میں پاکستان سے بہتر شاعری ہو رہی ہے۔

(۱۶/مارچ ۱۹۹۵ء)

آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں کے ذریعے منظرِ عام پر آتا ہے

کتاب پڑھنا، کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ جب کوئی شخص کتاب لکھنے کا فیصلہ کر لیتا ہے (اور یہ فیصلہ عموماً قوتِ فیصلہ کی کمی کے باوجود کیا جاتا ہے) تو کاغذ اور قلم کو ایک دوسرے کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ان دونوں کے گھتم گھتا ہونے کے نتیجے میں سفید کاغذ جب اچھی طرح رُوسیاہ ہو جاتا ہے، تو کتاب وجود میں آجاتی ہے اور جوش صاحب کا یہ قول:

لکھ رہی ہیں لکھ رہی ہیں انگلیاں

سچ ثابت ہو جاتا ہے، کیونکہ آج کل کتابیں ذہن کی بجائے انگلیوں ہی کی محنت کا حاصل ہوتی ہے۔

اس کے برعکس کتاب پڑھنا ہفت خوانِ رستم طے کرنے کے مترادف ہے۔ سب سے پہلا مرحلہ تو کتاب خریدنے کا ہے۔ صورتِ حال یہ ہے، تحت الثریٰ میں محفوظ کیے جانے کے قابل کتابوں کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ کتاب کی قیمت اگر سو روپے سے کم ہو، تو عام طور پر ناشر کو کم ہمت، مصنف کو غیر اہم اور خریداروں کو مفلس سمجھا جاتا ہے اور یہ نکتہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ افلاس کا تعلق کتاب کی قیمت سے نہیں، اس کے متن سے ہوتا ہے۔ بہرحال کتاب کی ظاہری خوبصورتی سے متاثر ہو کر کتاب خرید لی جائے اور اسے پڑھنا شروع کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر و باطن کا فرق انسانوں ہی میں نہیں، کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ پچھلے دس برسوں میں دو چار کتابیں ہی ایسی ہوں گی، جنھیں ہم نے لفظ بلفظ پڑھا ہو گا ورنہ

کتاب اور مصنف کا نام دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے اندر کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا، گویا ہم الفاظ دیکھ کر خط کا مضمون بھاپ لیتے ہیں۔ بعض کتابیں اس لائق ہوتی ہیں کہ ان کے فلیپ کی عبارتیں پڑھی جا سکتی ہیں اور بعض کے دیباچے بھی لائق مطالعہ ہوتے ہیں، بشرطیکہ فلیپ کی طرح وہ بھی دوسروں کے لکھے ہوئے ہوں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آج کل بہترین مزاحیہ ادب فلیپوں اور دیباچوں ہی کے ذریعہ منظرِ عام پر آ رہا ہے۔

کتابیں خرید کر پڑھنے والی بات تو ہم نے تکلفاً عرض کی ہے، ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ ہمیں کتابیں عموماً تحفۃً ملتی ہیں، جنھیں ہم ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ انھیں پڑھنے کی ہمت اس لیے نہیں ہوتی کہ کردہ گناہوں کی سزا سے خوف آتا ہے۔ لیکن کسی کسی کتاب کے ظاہری محاسن سے متاثر ہو کر دھوکا کھا کر ہم اس کے باطن میں بھی جھانک لیتے ہیں، جس کا نتیجہ کبھی کبھار خوشگوار بھی ہوتا ہے۔

اس وقت ایک ایسی ہی کتاب ہمارے سامنے ہے، جس کا نام ہے "آئینہ کیوں نہ دوں" اور مصنف کا نام نامی ہے، اظہر حسین صدیقی۔ کتاب کا نام تو ہمارے لیے نیا نہیں، البتہ مصنف کا نام پہلی بار سنا ہے، اگر یہ بھی غالب کے کسی مصرعے کا جزوِ اوّل یا جزوِ آخر ہوتا، تو ہم اس سے بھی مانوس ہوتے۔

مصنف بننے کا عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اخباروں کے ادبی صفحے پر اپنا نام اُچھالا جاتا ہے، پھر ادبی رسالوں میں ان کے مدیروں کی تعریف میں خطوط چھپوائے جاتے ہیں اور آخر میں ان رسالوں کو سالانہ چندہ بھیج کر تخلیقات شائع کرائی جاتی ہیں۔ اظہر حسین صدیقی نے یہ طویل راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ راست اقدام کے ذریعہ ایک عدد کتاب کے ساتھ ادبی دنیا پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ حملہ آور دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو مالِ غنیمت سمیٹ کر واپس چلے جاتے ہیں اور دوسرے وہ جو حملہ کے بعد خطۂ غیر میں مستقل طور پر آباد ہو جاتے ہیں۔ اظہر صاحب دوسری طرح کے حملہ آور معلوم ہوتے ہیں، ادبی دنیا میں وہ مستقل طور پر بود و باش کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہم نے مصنف کے ذاتی حالات سے واقف ہونا چاہا، تو کتاب نے کوئی رہنمائی نہ کی۔ اِدھر اُدھر سے پوچھا، تو صرف اتنا معلوم ہوا کہ موصوف "جنگ" کراچی میں "مازح" کے گریہ آور نیم قلمی کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتے رہے ہیں اور انکم ٹیکس کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر

فائز رہے ہیں۔ اس کے بعد مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہ رہی، کیونکہ انکم ٹیکس والے دوسروں پر ٹیکس لگانے یعنی انھیں اذیت پہنچانے کے عادی ہوتے ہیں، اسی عادت کے تحت کبھی کبھی وہ کتابیں بھی لکھ دیتے ہیں۔ لیکن اظہر صاحب کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ یہ محکمانہ عادت کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے صاف ستھرے ادبی ذوق کی آئینہ دار ہے، اس کا مقصد اذیت رسانی نہیں، مسرت خیزی ہے۔

یہ کتاب ان طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو مصنف نے گزشتہ ۱۰۔۱۵ برسوں میں وقتاً فوقتاً لکھے ہیں۔ ان مضامین کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بے شمار معاشرتی برائیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جن میں ادب اور سیاست بھی شامل ہیں۔ معاشرے کے بہت سے تاریک پہلوؤں اور منافقانہ رویوں پر پڑے ہوئے تہ در تہ نقاب اس ہنرمندی سے اٹھائے گئے ہیں کہ مصنف کے مشاہدے کی گہرائی اور انداز تحریر کی دلکشی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ وہ معاشرتی برائیوں کی نشاندہی اس طرح نہیں کرتے، جس طرح انسدادِ منشیات کے اشتہاروں میں کی جاتی ہے، یعنی خوف ناک اور عبرت انگیز انجام سے ڈرا کر برائیوں کی بیخ کنی کی دعوت نہیں دیتے، بلکہ وہ مسئلے کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کر کے قاری کو مثبت انداز میں سوچنے کی راہ دکھاتے ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے، لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

اوپر کے پیراگراف میں ہم نے کتاب اور مصنف کی اتنی تعریف کر دی ہے کہ اپنے لکھے پر ہمیں کسی پیشہ ور دیباچہ نگار کی تحریر کا گمان ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کتاب کا ایک آدھ اقتباس دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کر دیا جائے، تا کہ یہ کوئی نہ کہہ سکے کہ ہم جب کسی مصنف کے عیب گنواتے ہیں، تو بے شمار ثبوت پیش کرتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں تو دعویٰ ثبوت کے بغیر ہوتا ہے۔

آج کل شادیوں میں ویڈیو فلم بنانے کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ شادی کا مقصد خانہ آبادی سے زیادہ فلم سازی نظر آنے لگا ہے۔ اس سلسلے میں جناب مصنف لکھتے ہیں۔۔۔

''شادی بیاہ میں نکاح کی تقریب تو ایک ثانوی سی شے ہو کر رہ گئی ہے، جب کہ اصل تقریب فوٹو اور ویڈیو فلم کی تیاری ہے۔ کیونکہ فلم بنانے والے کے بغیر نہ تو برات روانہ ہو سکتی ہے اور نہ نکاح ہو سکتا ہے۔ ہم خود ایک ایسی تقریب نکاح میں شریک ہو چکے ہیں، جہاں ویڈیو فلم بنانے والے کے وقت پر نہ پہنچنے کے سبب تمام تقریب مع تفصیلات کے دوبارہ منعقد ہوئی۔۔۔۔ ان

حالات کو دیکھتے ہوئے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ آئندہ بچوں کی شادی کی تقریب کے کارڈ کا مضمون کچھ اس طرح ہوگا۔

محترمی! ہمارے بیٹے کی ویڈیو فلم بننا طے پایا ہے اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی تقریب نکاح بھی ہوگی، ہم آپ کے بے حد ممنون ہوں گے، اگر آپ اس تقریب سعید میں شرکت فرما کر ہمیں اپنی فلم بنانے کا موقع دیں گے اور ہمارے اہل خانہ کے ساتھ فلم سازی میں شریک ہوں گے۔
نوٹ:۔ فلم رنگین بنے گی، اس لیے گذارش ہے کہ لباس اسی مناسبت سے پہن کر آئیں۔"

مصنف سے ہمیں ایک شکایت ہے کہ انھیں خامہ فرسائی کا ضرورت سے زیادہ شوق ہے۔ نہ صرف یہ کہ پوری کتاب انھوں نے خود ہی لکھی ہے، بلکہ سرورق پر جہاں خالی جگہ نظر آئی ہے، اسے بھی اپنے ارشادات وملفوظات سے پُر کر دیا ہے۔ دیباچہ اور فلیپ عموماً مشاہیر ادب سے لکھوائے جاتے ہیں، تاکہ کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو، یہ چیزیں جناب مصنف نے خود ہی لکھی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کتاب کی صرف قیمت ہی میں اضافہ ہو سکا، قدر کا معاملہ التوا میں پڑ گیا۔

دائیں طرف کے فلیپ پر جناب مصنف لکھتے ہیں......

"دستور کے مطابق کتاب کے فلیپ پر ممتاز دانشوروں اور نامور ادیبوں کی آراء کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں چھپنا ضروری ہیں۔ اوّل تو کوئی مستند نقاد اور ادیب ہمارے اور ہماری کتاب کے بارے میں لکھ کر ادب میں اپنا نام کھونے پر تیار ہی نہیں ہوا، البتہ کچھ لوگوں کو ہم نے تعلقات ختم کرنے کی کامیاب دھونس دے کر راضی بھی کر لیا تھا، مگر جتنی تعریف ہم چاہتے تھے، وہ کرنے پر تیار نہیں ہوئے، اس درمیان میں یہ ہوا کہ ــــ ہمارا ضمیر ایک دم جاگ اٹھا اور اس نے للکارا، اپنے ذرا سے فائدہ کی خاطر کیوں دوسروں کو خوار کراتے ہو۔ اور ہم نے پہلی دفعہ بے چوں وچرا اس کی بات مان لی اور فلیپ نہیں لکھوایا۔"

اظہر صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ آج کل فلیپ نگاری کی "صنعت" خاصی ترقی کر چکی ہے۔ ایسے ایسے ممتاز دانشور اور نامور ادیب موجود ہیں، جنھوں نے فلیپ لکھنے کی سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا، بلکہ یہ کام بھی وہ خود نہیں کرتے، صاحب کتاب ہی سے فلیپ لکھواتے ہیں اور آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیتے ہیں۔ اظہر صاحب نے ضمیر کے جاگنے والی جو بات کہی ہے، اسے بھی آرائش بیان سمجھنا چاہیے۔ دوسروں سے چند سطریں لکھوانے پر جن کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے،

حیرت ہے کہ خود پوری پوری کتابیں لکھ دیتے ہیں، مگر ضمیر سوئے کا سویا ہی رہتا ہے۔

دوسرے فلیپ پر اظہر صاحب نے اپنے کوائف ان الفاظ میں درج کیے ہیں......

''فلیپ کے اس حصے پر آج کل کے رواج کے مطابق مصنف کا سنِ پیدائش (اب اتنی پرانی باتوں کا کیا ذکر کرنا) جائے پیدائش (جو سارے جھگڑوں کی جڑ ہے)..... اس کا پیشہ (جو کوئی قابل فخر بات نہیں ہے)..... یہ تمام باتیں لکھی جانی ضروری خیال کی جاتی ہیں، ہمارا خیال ہے کہ صرف کتاب ضروری ہے، سو وہ حاضر ہے۔''

ہمارے خیال میں یہ سطریں لکھ کر بلا ضرورت مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر مصنف کو اپنا سال پیدائش ضرور بتا دینا چاہیے، ورنہ جس طرح علامہ اقبال کے سال پیدائش پر محققوں میں طویل معرکہ آرائیاں ہو چکی ہیں ویسی ہی معرکہ آرائیاں ہر مصنف کے سال پیدائش کے مسئلے پر ہوتی رہیں گی، نتیجتاً اس کی پیدائش ہی مشکوک ہو کر رہ جائے گی۔ ہر مصنف کو اپنی جائے پیدائش بھی ضرور ظاہر کر دینی چاہیے، اس طرح مصنف کی اولاد کو بیروزگار ہونے کی صورت میں یہ معلوم ہو جائے گا کہ بیروزگاری کا سبب کوٹا سسٹم نہیں، غلط جائے پیدائش ہے، ہر مصنف کو اپنا اصل پیشہ بھی ضرور بتا دینا چاہیے تاکہ پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ موصوف کس قسم کی پریشانیوں کی وجہ سے اپنے پیشہ وارانہ فرائض کو نظر انداز کر کے ادب کی خدمت فرما رہے ہیں۔

مذکورہ اقتباس کا آخری جملہ (''صرف کتاب ضروری ہے، سو وہ حاضر ہے'') بھی لکھنے والے کی خوش فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور بڑی حد تک مبہم ہے۔ مصنف کو صاف صاف بتانا چاہیے تھا کہ کتاب کی اشاعت کس کے لیے ضروری ہے، خود اس کے لیے۔ یا دوسروں کے لیے جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے اس کی اکثریت تو دیوان غالب کو بھی غیر ضروری سمجھتی ہے۔

سرورق کے بائیں جانب کے صفحے پر ایک خالی چوکھٹا چھاپا گیا ہے اور اس کے نیچے مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ انھوں نے اپنی تصویر سے چوکھٹے کی عزت افزائی کیوں نہیں کی، انھوں نے اگرچہ اس کی کئی معقول وجوہ بیان کی ہیں، لیکن اصل وجہ نہیں بتائی۔ اصل وجہ وہی ہے، جو ہم کچھ عرصہ قبل کسی دوسری کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے بیان کر چکے ہیں اور وہ یہ ہے کہ..... ہمارے بیشتر مصنف اپنی جو تصویریں چھپواتے ہیں انھیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ شاید پولیس کے ریکارڈ سے نکال کر چھپوائی گئی ہے۔

حیدر آباد، فرخندہ آباد کی سیر

شخصی خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے۔ یہ غزل جیسی صنفِ ادب نہیں کہ ردیف وقافیہ کے گلدان میں پامال مضامین کو کاغذی پھولوں کی طرح سجا دیا جائے۔ یہ نثری نظم بھی نہیں کہ لفظوں کو ان کے معنوں سے جدا کر کے چھوٹی بڑی سطروں میں دفن کر دیا جائے۔ یہ علامتی افسانہ بھی نہیں کہ نثری نظم والوں کے دفن کردہ الفاظ کو جھاڑ پونچھ کر دوبارہ صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا جائے۔ یہ جدید سفرنامہ بھی نہیں کہ سفرنامہ نگار خود تو ایئر ہوسٹسوں کے نرغے میں پرواز کرتا رہے اور بیچارہ قاری حیرت واستعجاب کی وادیٔ پُرخار میں پیدل چل چل کر اپنے تلوے لہولہان کر لے۔

شخصی خاکہ نگاری کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو ایسی آنکھ چاہیے جو کسی شخص کے ظاہر و باطن کا مشاہدہ کر سکے۔ پھر وہ بصیرت چاہیے جو ان عوامل کا تعین کر سکے جو کسی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تیسری چیز حقیقت بیانی ہے، یعنی موضوع کو اسی طرح پیش کیا جائے جیسا وہ ہے، نہ کہ لکھنے والا اپنی منشاء کے مطابق اس کے خدوخال سنوارے یا بگاڑے۔ چوتھی اور سب سے اہم چیز یہ ہے کہ خاکہ نگار کو لکھنے کا فن آتا ہو۔ وہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہو۔

ہمارے بہت کم خاکہ نگاران چار شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ اگر کسی کے پاس مشاہدہ ہے تو اس یہ معلوم نہیں کہ اسے کس طرح پیش کیا جائے۔ یا پھر اکثر خاکہ نگاروں نے یہ فارمولا بنا رکھا ہے کہ موضوع کی خوبیوں کے ساتھ دو چار خامیاں بھی بیان کر دی جائیں تاکہ توازن برقرار رکھا جا سکے۔ بعض توازن کے قائل نہیں، وہ موضوع کو ہیرو بنا کر پیش کرتے ہیں اور بعض خاکہ نگار اپنی ذات کو اس حد تک نمایاں کرتے ہیں جیسے وہ کسی اور کا خاکہ نہیں لکھ رہے، بلکہ اس سے اپنا خاکہ لکھوا یا اُڑوا رہے ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُردو میں اچھے خاکے نہیں لکھے گئے۔ لکھے گئے ہیں اور خاصی

تعداد میں۔ مثلاً پچھلے ڈیڑھ سال میں کم از کم دو مجموعے ضرور ایسے شائع ہوئے ہیں جن میں اچھے خاکے، خراب خاکوں کی نسبت زیادہ ہیں۔ ان میں سے ایک مجموعہ پاکستان میں شائع ہوا ہے اور دوسرا ہندوستان میں۔ پاکستانی مجموعہ بزرگ افسانہ نگار ممتاز مفتی کا ہے، ''اوکھے لوگ'' (اوکھے، پنجابی لفظ ہے جس کا مطلب ہے ''مشکل'')۔ ہندوستانی مجموعے کا نام ''خاکے'' ہے اور اس کے مصنف ہیں عوض سعید۔

ممکن ہے عوض سعید کا نام ہمارے بعض پڑھنے والوں کے لیے نیا ہو۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ بعض پڑھنے والوں کے لیے غالبؔ کا نام بھی نیا ہوتا ہے۔ غالبؔ کا تعارف نامہ تو ہم پھر کبھی پیش کریں گے، فی الحال عوض سعید کے بارے میں عرض ہے کہ وہ خاصے پرانے اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ پاکستانی رسالوں خصوصاً میرزا ادیب کے زمانے کے ''ادب لطیف'' میں ان کی کئی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ اب تک ان کے افسانوں کے چار مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، جنھیں ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔ ان چاروں مجموعوں کو ہندوستان کی مختلف اردو اکیڈیمیوں کے انعامات بھی مل چکے ہیں۔ یہ بات ہم نے قیاساً لکھی ہے۔ ہمارا قیاس اس لیے غلط نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں اردو کتابوں پر کثرت سے انعامات دیئے جاتے ہیں۔ یہ انعام اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ کتابیں کم پڑ جاتی ہیں۔ تب مسوّدوں کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ آخر میں ان کتابوں کی باری آتی ہے جو ابھی بطنِ مصنف میں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد بھی گنجائش رہ جائے تو کتابوں کی بجائے افراد کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے، جیسے حال ہی میں مجوزہ عالمی اردو کانفرنس کی طرف سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور بعض دوسرے ادیبوں کے لیے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس انعام کی خوبی یہ ہے کہ انعام لینے والے ہی نہیں، دینے والے بھی ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں، اس لیے وہ دوہری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

آیئے اب اصل موضوع کی طرف لوٹیں۔ اگر ادھر اُدھر کی باتوں کا سلسلہ کچھ دیر اور چلتا رہا تو ڈر ہے کہ کہیں عوض سعید کی کتاب ''خاکے'' پر بھی کسی انعام کا اعلان نہ ہو جائے۔ لہٰذا انعام ملنے سے پہلے اس کتاب پر اظہار کر لیا جائے تو بہتر ہے، ورنہ بعد میں کسی کو اس کتاب میں کوئی خوبی نظر نہیں آئے گی۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شخصیات کے حوالے سے حیدر آباد

دکن کی ثقافتی فضا اور ادبی ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہم نے تو حیدر آباد دکن کو مرزا ظفر الحسن مرحوم یا پھر خواجہ حمید الدین شاہد کے حوالے سے دیکھا ہے۔ مرزا صاحب نے حیدر آباد کی تہذیبی زندگی پر بہت سی یادگار تحریریں چھوڑی ہیں۔ خواجہ حمید الدین شاہد کو خدا سلامت رکھے کہ حیدر آبادی تہذیب کا چلتا پھرتا نمونہ ہیں۔ اس شہرِ بے مثال کے بارے میں اب عوض سعید نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی کتاب پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ قاری اپنے کلبۂ احزاں سے دور، حیدر آباد فرخندہ بنیاد کی گلیوں، کوچوں اور ادبی محفلوں کی سیر کر رہا ہے۔ کہیں کسی ہوٹل میں ادیب جمع ہیں اور کہیں کسی قیام گاہ پر محفل گرم ہے۔ غرض ہر طرف گہما گہمی دکھائی دیتی ہے اور زبان بھی وہی سنائی دیتی ہے جو حیدر آباد میں بولی جاتی ہے۔

عوض سعید نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں، ان میں بیشتر معروف ادبی شخصیات ہیں۔ مثلاً مخدوم محی الدین، ابراہیم جلیس، عالم خوندمیری، سلیمان ادیب، قاضی سلیم، اقبال متین، مغنی تبسم، جیلانی بانو، عزیز قیسی وحید اختر وغیرہ۔ ہم نے ان ادیبوں کے صرف نام سنے تھے، اب عوض سعید کی مہربانی سے انھیں ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو جی خوش ہوا۔ بعض بالکل نئی اور دلچسپ باتیں بھی معلوم ہوئیں۔ مثلاً:

* **مخدوم محی الدین:** طبعاً بڑے سادہ مزاج تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کی چیزیں رسائل کی زینت بنتی تھیں تو وہ بلا جھجک بک اسٹال پر جا کر سارے پرچے خرید لیتے۔ ایسے وقت وہ بڑے معصوم لگتے، یہ معصومیت ہی دراصل ان کی شخصیت کی سب سے بڑی پہچان تھی ـــــ مخدوم عرب نژاد تھے۔ ان کا خاندانی نام "ابوسعید محمد مخدوم محی الدین حذری" تھا۔ عربوں کی بے پناہ خوبیوں کے ساتھ ان کی ذات میں چند کمزوریاں بھی در آئی تھیں..... ان کے جذباتی ہونے کا عکس جا بجا ان کی پُر جوش تقریروں میں کہیں نہ کہیں عیاں ہو جاتا تھا۔ تنقید سننے یا سہنے کا حوصلہ ان کی ذات میں ذرا کم کم ہی پایا جاتا تھا۔ وہ (کمیونسٹ) پارٹی سے کچھ اتنے جڑے ہوئے تھے کہ ذرا بھی کسی نے چبھتا ہوا جملہ کسا، وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ پھر انھیں لاکھ سمجھائیں وہ اُکھڑ سے جاتے تھے۔ مجھے اورینٹ کی وہ سلگتی شام آج بھی یاد ہے، جب انھوں نے غصے کے عالم میں اپنے ہی ایک ساتھی کے گال پر طمانچہ جڑ دیا تھا۔
* **قاضی سلیم:** جس زمانے میں وہ اورنگ آباد میں وکالت کیا کرتے تھے، انھی دنوں

اتفاق سے انور معظم سے ان کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب انور نے ان سے پوچھا کہ وکالت کیسی چل رہی ہے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا، خوب چل رہی ہے۔ آج ہی ایک آدمی کو چار سال قید کروادی ہے۔ پھر انور نے پوچھا وکیل کون تھا؟ تو انھوں نے کہا، میں تھا۔ انور نے حیرت سے پوچھا، چار سال کی سزا کیسے ہوگئی؟ انھوں نے جواب دیا، چار سال سے زائد ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

٭ مغنی تبسم: انھوں نے اپنے لیے ایک شیڈول بنالیا ہے جو ہر سال تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی شاذ کو فیض پر فوقیت دے دی تو کبھی دبلے پتلے مصحف اقبال کو اچانک پہلوانوں کے اکھاڑے میں کھڑا کر دیا۔ کبھی ایک کا ہاتھ تھاما تو کبھی دوسرے کا گریبان چاک کیا۔ کبھی کھائی میں گرے ہوئے کسی اَدھ موئے شاعر کو آواز دی تو دوسری طرف خاصے بھلے شاعر کو کنویں میں دھکیل دیا۔

٭ وحید اختر: اپنے آگے دوسروں کو ہیچ اور حقیر سمجھنے کا جذبہ وحید کے خمیر میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس کے ثبوت کے لیے کبھی آپ اس سے مل کر دیکھیے۔ وہ مصافحہ کے دو منٹ بعد ہی فقرہ بازی پر اُتر آئے گا۔ پہلے آپ کو خاص انداز سے دیکھے گا، پھر مسکرائے گا۔ (اگر آپ شاعر ہیں، اسے اپنا مجموعہ پیش کریں گے تو وہ کہے گا) ہم نے آپ کا مجموعہ بادلِ نخواستہ پڑھا ہے۔ ہمارا خیال ہے بعض کتابوں کی عدم اشاعت ہی میں ادب کی خدمت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ آپ کی کتاب بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ آپ نے اپنی اوقات سے کہیں زیادہ پیسہ فضول اس مجموعے میں لگادیا۔ بہتر ہوتا کہ آپ اپنے لیے کچھ نئے کپڑے سلوا لیتے۔

اگر کوئی اس سے کہے کہ وحید اختر ہم نے آپ کا شعری مجموعہ خریدا ہے اور آج کل وہی زیرِ مطالعہ ہے۔ اس پر وہ خوش نہیں ہوگا کہ ایک کتاب فروخت ہوگئی اور نہ اس بھلے مانس سے وہ اپنی نظموں اور غزلوں کے متعلق پوچھے گا۔ اس کا جواب تو یہی ہوگا کہ آپ نے خواہ مخواہ ہمارا مجموعہ خریدنے کی حماقت کی۔ ہماری شاعری آپ کے پلّے پڑنے سے تو رہی۔

(۲۷ر نومبر ۱۹۸۶ء)

شاعری پر شب خون

شمس الرحمٰن فاروقی اردو کے اُن چند نقادوں میں سے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں رجحان ساز نقاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی گواہی محمد حسن عسکری بھی دے چکے ہیں، جنھوں نے ایک مرتبہ یہ لکھا تھا کہ حالی کے بعد اردو تنقید فاروقی کے ذریعے ایک نئے معیار سے آشنا ہوئی ہے۔ فاروقی کا مطالعہ حیران کن حد تک وسیع ہے۔ وہ بیک وقت مشرق و مغرب کی ادبی روایات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ انھیں عروض اور معانی و بیان جیسے بے برکت علوم پر بھی ماہرانہ دسترس حاصل ہے۔

فاروقی ۱۹۶۶ء سے رسالہ ''شب خون'' شائع کر رہے ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں میں اس رسالے نے جدید ادبی رجحانات کو متعارف کرانے میں اور جدید ادیبوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔ ''شب خون'' رسالہ نہیں ایک تحریک ہے جو اردو ادب میں نئے خیالات و رجحانات کی آب یاری کر رہی ہے۔ جس طرح زلزلے اور سیلاب جیسی آفات ارضی کے متاثرین بے شمار ہوتے ہیں، اسی طرح ''شب خون'' سے متاثر ہونے والوں کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے۔

جدیدیت اور جدیدیوں سے ہماری کوئی ذہنی قربت نہیں ہے۔ ہم پرانے زمانے کے آدمی ہیں۔ ہمیں کسی جدید چیز میں اس وقت تک کوئی خوبی نظر نہیں آتی جب تک اس پر قدامت کی گرد جم نہ جائے۔ فاروقی کو بھی ہم نے اسی لیے پسند کیا ہے کہ انھیں لکھتے ہوئے ۳۰-۳۵ برس گزر چکے ہیں۔ اپنی ساری قدامت پسندی کے باوجود ہم ''شب خون'' کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ جب بھی اس کا تازہ شمارہ آتا ہے تو ہم سب کام چھوڑ کر اس کا مطالعہ کرتے

ہیں اور مطالعے کے جوش میں سب کام چھوڑنے پڑتے ہیں یوں کہ کچھ دنوں تک ہم اس لائق نہیں رہتے کہ کوئی کام کر سکیں۔ حال ہی میں خوش قسمتی سے ”شب خون“ کے پانچ شمارے ایک ساتھ ملے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ دولت بھی وہ جس کے بارے میں یگانہ نے کہا تھا:

دنیا کا کیا بھروسا، دولت کا کیا ٹھکانا
دولت تو دولت آخر لٹنے کی نوبت آئی

سو اس دولت کو بے دریغ لٹانے کے لیے ہم یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

”شب خون“ کے تازہ شماروں میں سے کسی ایک میں اختر الایمان کا وہ معرکہ آرا انٹرویو بھی شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اقبال، فیض، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور دوسرے کئی شاعروں کو رد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ موجودہ زمانے میں بہترین اردو شاعری، پاکستان میں نہیں، ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ اختر الایمان کا یہ فیصلہ پاکستانی شاعروں کو ضرور ناگوار گزرے گا اور وہ یہ کہیں گے کہ ہماری شاعری کا مطالعہ کیے بغیر یک طرفہ فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ آزردہ خاطر نہ ہوں۔ اختر صاحب نے جو فیصلہ دیا ہے، اس کے لیے انھیں پاکستانی تو کیا، ہندوستانی شاعری بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ فیصلہ اختر صاحب نے اپنی شاعری کے حوالے سے دیا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہیں، اگر وہ جھومان کے باشندے ہوتے تو پھر بہترین شاعری وہیں ہو رہی ہوتی۔

ہم نے چوں کہ انصاف پسند طبیعت پائی ہے، اس لیے ہمارے دل نے یہ گواہی دی کہ اختر الایمان جیسا بڑا شاعر غلط بیانی سے کام نہیں لے سکتا۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے یقیناً اس کی بنیاد محض دلائل پر نہیں ٹھوس حقائق پر ہوگی۔ صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہم نے ”شب خون“ کے پانچوں شماروں میں شائع شدہ غزلوں کو بغور پڑھا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اختر صاحب مطالعے کے بغیر جس نتیجے پر پہنچے تھے، مطالعے کے بعد ہمیں اسی نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ اب ہماری بھی یہی رائے ہے کہ بہترین اردو شاعری ہندوستان ہی میں ہو رہی ہے۔ پاکستانی شعرا خواہ مخواہ پڑھنے والوں کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ ہندوستانی شاعروں کی تقلید کر کے اپنی شاعری کو بہتر بنائیں، ورنہ کوئی دوسرا آبرو مندانہ شغل اختیار کریں تا کہ سیاست کی طرح شاعری بھی ہمارے ملک کی بدحالی کا باعث نہ ہو۔

ہندوستان کی اردو شاعری کی خصوصیت کا ایک کالم میں سمیٹنا ممکن نہیں، اس لیے

دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ لہٰذا ہم مختصر طور پر خاص خاص خوبیوں ہی کی طرف اشارہ کریں گے تا کہ کسی حد تک یہ اندازہ ہو سکے کہ ہندوستان کی اردو شاعری، پاکستان کی شاعری سے کیوں بہتر ہے اور عالمی ادب کی سطح پر اس کی الگ شناخت کیا ہے۔ ہم بحث کے دوران صرف شعر درج کریں گے، شاعروں کے نام نہیں بتائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعروں کے صرف نام ہی الگ الگ ہیں، باقی سب کچھ یعنی کلام اور انداز بیان وغیرہ ایک ہی جیسا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ساری غزلیں کسی ایک شاعر نے لکھ کر بہت سے شاعروں کے نام سے چھپوا دی ہیں۔ ممکن ہے یہ ''ایک شاعر'' خود شمس الرحمن فاروقی ہوں۔ انھوں نے بڑا زرخیز ذہن پایا ہے۔ ان کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ ۲۰-۲۵ مختلف ناموں سے غزلیں لکھ دیں بہرحال اصل شاعر کوئی بھی ہو، ہم شاعری کے حوالے سے گفتگو کریں گے۔

سب سے پہلی چیز جو قاری کو اپنی گرفت میں لیتی ہے، وہ یہ ہے کہ شاعر کو نئے نئے مضمون سوجھتے ہیں یا یوں کہیے کہ خاصی دور کی سوجھتی ہے۔ مثلاً:

کپڑوں کی الماری کھولے کھڑا ہوں میں حیران
نہیں ہے میرے ناپ کا اس میں کوئی ایک لباس

کسی دوسرے کے کپڑوں کی الماری کھول کر حیران ہونا ایک بالکل نیا خیال ہے۔ اپنے کپڑوں کی الماری شاعر نے شاید اس لیے نہیں کھولی کہ اس میں سوائے خلعتِ سخن کے کچھ نہیں تھا لہٰذا رقیب کے کپڑوں کی الماری کھول لی۔

حیران ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر کو چونکنے کا بھی شوق ہے۔ اس شوق کی خاطر فرماتے ہیں:

رستے میں کچھ تو ایسا ہو جس کو دیکھ کے چونک پڑیں
اور نہیں تو دو کاریں ہی آپس میں ٹکرا جائیں

جس راستے میں کاروں کے ٹکرانے کا منظر دیکھنے کی خواہش ہے، وہ راستہ کالج کی طرف جاتا ہے کیوں کہ جناب شاعر ابھی زیر تعلیم ہیں۔ ایک شعر میں انھوں نے اپنا تعلیمی نصاب بھی بتا دیا ہے:

مرے کالج میں ہر جانب ترا ہی نام لکھا ہے
تجھے ہی پڑھنے جاتا ہوں تجھے ہی پڑھ کے آتا ہوں

جو شاعر دورانِ تعلیم ایسے عمدہ شعر کہہ سکتا ہو تعلیم کی تکمیل کے بعد تو معلوم نہیں وہ کیا قیامت ڈھائے گا لیکن قیامت ڈھانے سے پہلے بھی اُسے کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ مثلاً

دیتے، چلتی ہوئی جوتیاں اور کھڑی ہوئی بسیں بھی نظر آتی ہیں:

جرابیں اور جوتیاں تو اُس کی
سفر کے سارے عذاب میرے

☆

سب تھکے ہارے لوگوں کو گھر چھوڑ کر
اپنے اڈوں پہ خالی بسیں رہ گئیں

دوسرا شعر علامتی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ شعروں کو خالی بسیں سمجھنا چاہیے کیوں کہ مسافرانِ معانی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔

شب خونیوں نے غزل کا دامن اتنا وسیع کردیا ہے کہ اس میں مشرق سے مغرب تک، جنوب سے شمال تک اور جنوری سے دسمبر تک کی ہر چیز سما گئی ہے:

تمام رنج و ملال اوڑھے
بدن نے سب ماہ و سال اوڑھے
میں مغربوں کے سفر میں مشرق
جنوب میں بھی شمال اوڑھے
لہو میں سلگا کے جون موسم
ملے دسمبر میں شال اوڑھے

ان شعروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شال میں لپیٹ کر بھی اچھے شعر کہے جاسکتے ہیں۔ اوڑھنے بچھونے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی شاعری میں ایسے فلسفیانہ مسائل پر بھی اظہارِ خیال کیا گیا ہے جن پر پوری پوری کتابیں لکھی جاسکتی ہیں، لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ صرف دو دو مصرعوں میں بات مکمل کردی گئی ہے:

محفل میں رات گیت یہ تھا مجھ سے وصل کر
گویا مغنّیہ کو کوئی کام ہی نہیں

☆

گناہ کھلتے ہیں میرے کس کس آنگن میں
یہ بھید مرنے سے پہلے مجھے بتانے ہیں

مگر شاعر یہ بھید نہیں بتائے، البتہ اس نے ایک اور اہم راز فاش کردیا ہے:

گئے سال کی روشنی پی گیا
نئے سال کا یہ کیلنڈر سیاہ

غزل میں پیٹے پلانے کا ذکر کوئی نئی بات نہیں، نئی بات یہ ہے کہ غیر مردف غزل میں قافیہ مصرعے کے آخر میں آتا ہے، لیکن مندرجۂ بالا شعر میں شروع میں آیا ہے۔ ''گئے'' اور ''نئے'' سے دونوں مصرعوں کا آغاز صوتی اعتبار سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی شاعر غزل کی ہیئت میں نئے نئے تجربے کر رہے ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر قافیہ مصرعوں کے درمیان لایا جائے۔

ہم نے اب تک جو شعر پیش کیے ہیں، وہ موضوعات اور لفظیات کے اعتبار سے جدید ترین ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ زبان کی شاعری نہیں کی جارہی۔ کی جارہی ہے اور نوح ناروی سے بہتر کی جارہی ہے:

کہیں بھی تو کیا اس سے سب جان کر کے
اڑا دے گا ایران توران کر کے
سمجھ بوجھ کے خوب پہچان کر کے
وہ جب مجھ سے بولا تو انجان کر کے

اسی طرح سہلِ ممتنع کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں مثلاً:

پس دیوار سایہ، دھوپ ننگی
چلے آؤ میاں کوئی نہیں ہے

سہلِ ممتنع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ اگر شعر کو نثر میں تبدیل کیا جائے تو لفظوں کی ترتیب میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو۔ اس شعر کو نثر میں تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے کیوں کہ یہ پہلے ہی نثر میں ہے۔ معنوں میں تبدیلی کی بھی گنجائش نہیں ہے کیوں کہ تبدیلی اُسی چیز میں کی جاسکتی ہے جو موجود ہو۔

ہم نے اوپر جو شعر مثالاً درج کیے ہیں، ایسے ہی تقریباً دو سو شعر اور بھی ''شبِ خون'' کے پیشِ نظر شماروں میں موجود ہیں، لیکن ان شعروں کو نقل کرنے کے لیے جس حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہے، اُس کے فقدان کے سبب ہم نقل نویسی کی مزید خدمت انجام دینے سے معذور ہیں، لہٰذا پاکستانی شاعروں سے گزارش ہے کہ وہ تھوڑے لکھے کو بہت جانیں اور یہ مان لیں کہ ہندوستان میں پاکستان سے بہتر شاعری ہو رہی ہے۔

(۱۶/ مارچ ۱۹۹۵ء)

Khawaj
Tariq
Rehman
Young.
Brother of
Mushfiq
Khawaja